خطباتِ مولانا عبید اللہ سندھی

مرتبہ

پروفیسر محمد سرور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

سندھ ساگر اکادمی۔ لاہور

قیمت عہ/۸ بار اوّل

گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں چھپ کر سندھ ساگر اکادمی ۵۰۸ ٹمپل روڈ لاہور سے
شائع ہوئی

عرض مرتب

حضرت شیخ الہند مرحوم نے سنہ ۱۹۱۵ء میں مولینا کو ایک اہم تاریخی مشن پر کابل بھیجا تھا۔ مولینا پورے سات سال تک اپنے استاد کے ارشاد کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرتے رہے اور آخر میں جب نتیجہ حسب توقع نہ نکلا تو آپ نے کابل کو خیرباد کہا اور روس تشریف لے گئے۔ روس کی سیاحت اور وہاں کے اشتراکی انقلاب کے مطالعہ کے بعد مولینا نے اپنے وطن عزیز کو اجنبی غلامی سے آزاد کرانے اور موجودہ پست زندگی سے نکال کر عزت و اقبال کے بلند مرتبہ پر لانے کے لئے ایک نیا لائحہ عمل سوچا۔ اور ترکی پہنچ کر اُسے اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا کہ شاید ان کے اہل وطن ادھر متوجہ ہوں۔ اور موصوف کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں۔ موصوف تقریباً تین سال تک ترکی میں رہے، اس اثنا میں انہوں نے سُنا کہ ہندوستان کی اسلامی جماعتوں کے بڑے بڑے رہنما مؤتمر خلافت کی شرکت کے لئے مکہ معظمہ آ رہے ہیں۔ مولینا اُن سے مل کر ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کرنے کے ارادے سے حجاز روانہ ہوئے۔ لیکن جب موصوف مکہ معظمہ پہنچے تو ہندوستانی زعماء واپس ہندوستان جا چکے تھے۔

مکہ معظمہ میں حضرت مولینا کا بارہ سال تک قیام رہا، یہاں انھیں نہ صرف اپنے تجربات اور افکار و خیالات پر از سر نو غور کرنے کا موقعہ ملا۔ بلکہ اس زمانہ میں ایک تو ان کے پاس ہندوستانی کے اخبارات، رسائل اور کتابیں پہنچتی رہتیں اور دوسرا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہر سال حج کے موقعہ پر ہزارہا ہزار ہندوستانی مسلمان مکہ معظمہ آتے۔ اور مولینا کو اُن سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کا اتفاق ہوتا۔ اس طرح وطن سے باہر رہ کر آپ کو وطن کی ہر چیز کی خبر ملتی رہتی۔ چنانچہ آپ ان حالات کی روشنی میں برابر اپنے علمی افکار اور سیاسی طریق کار کا جائزہ لیتے رہے۔

مارچ سنہ ۱۹۳۹ء تھا کہ حضرت مولینا واپس ہندوستان پہنچے، اور کراچی پر اترتے ساتھ آپ نے اپنے افکار و خیالات کی اشاعت شروع کر دی۔ موصوف فرداً فرداً ایک ایک سے ملے۔ لوگوں کے گھروں پر دستکیں دیں، عام مجمعوں میں تقریریں کیں۔ نوجوان طلبہ کو خواہ وہ انگریزی کالجوں کے ہوتے یا عربی مدارس کے، پکڑ پکڑ کر بلاتے۔ اور انھیں اپنی بات سمجھاتے اور جو کبھی ہم مشرب رہ چکے تھے۔ اور اب ہمت ہار کے بیٹھے ہوئے تھے۔ انھیں آپ جھنجوڑتے۔ ڈانٹتے اور سخت سست کہتے۔ مولینا نے

مضمون لکھے، اہم مسائل پر کتابیں لکھوائیں، اور جو نیاز مند استفادہ کرنے حاضر ہوتے۔ انھیں آپ پڑھاتے، اپنی یادداشتیں سناتے اور رات دن ایک کرکے ہفتوں اور مہینوں تک اپنے خیالات لکھواتے رہتے۔

مولینا کی جدوجہد محض زبان و قلم تک محدود نہ رہی۔ بے سروسامانی میں آپ نے ہندوستان کا کونہ کونہ چھان ڈالا۔ کھانے کو نہ ہوتا تو پھر بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔ بیماریوں کے سخت حملے ہوتے لیکن انکی ذرا بھی پروا کئے بغیر اپنا کام پوری مستعدی سے کئے جاتے۔ اس دوران میں آپ نے کئی ایک ادارے قائم کئے۔ ایک سیاسی پارٹی کی بنیاد رکھی۔ متعدد درسگاہیں بنائیں۔ اور شب و روز ان کاموں میں لگے رہتے۔ لیکن آخر جسم کے قوائے کب تک اس فوق العادت شوق و ہمت کا ساتھ دیتے۔ بڑھاپا اور پھر بیماریوں کا سخت زغہ اور اس پر جسمانی مشقت اور دماغی کاوش اس قدر کہ کڑیل سے کڑیل جوان بھی اس کی تاب نہ لاسکتا۔

جون ۱۹۴۴ء کی گرمیاں تھیں۔ اور مولینا سندھ کا دورہ فرما رہے تھے کہ صحت نے بالکل جواب دے دیا۔ جو رفیق کار ساتھ تھے وہ بڑی مشکل سے کراچی چلنے پر راضی کرسکے۔ کراچی میں کچھ عرصہ علاج ہوا۔ لیکن جب جسم کا پورا رس نکل چکا ہو تو دوا دارو سے کیا ہو سکتا تھا۔ کراچی سے آپ نے گوٹھ پیر جھنڈا چلنے کی خواہش کی۔ اور آخر میں اپنی صاحبزادی اور نواسے کی درخواست پر دین پور ریاست بہاولپور آگئے اور وہیں ۲۲ اگست ۱۹۴۴ء کو اس دار فانی سے انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولینا مرحوم کے خطبات اور مقالات کا یہ مجموعہ اہل ملک کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ اسے مولینا کے افکار و خیالات کی ایک تمہید سمجھنی چاہیئے۔ جو خود حضرت نے اپنے قلم سے مرتب کی۔ بے شک مولینا مرحوم کی بات ایک حد تک "ان سنی" رہ گئی ہے لیکن یقین فرمائیے کہ ان کی بات "ان کہی" نہیں رہی۔ مولینا جو کہتے تھے اور جس احساس پر ہماری نئی زندگی کی تعمیر کرنے کے متمنی تھے۔ اس ضمن میں انکے پورے افکار و خیالات انکے مسترشدین کے پاس محفوظ ہیں۔ امید ہے جوں جوں حالات اجازت دیں گے، مولینا مرحوم کے یہ افکار آپ حضرات کے سامنے آتے جائینگے

مولینا عبید اللہ سندھی اور انکا یہ پیغام زندگی کی آنی جانی چیز نہیں۔ بیشک وہ ہم میں نہیں رہے لیکن انکا پیغام ہمارے وطن کی فضاؤں میں برابر گونجتا رہیگا۔ اور آج نہیں تو کل زمانے کے تقاضے مجبور کردینگے کہ ہم ادھر کو چلیں، جس طرف کی راہ حضرت مولینا مرحوم ہمیں دکھا گئے ہیں

فہرست

مقدمہ

گذشتہ جنگ عظیم میں برطانیہ نے ترکی کے خلاف لڑائی کا اعلان کیا، تو اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑی بےچینی پھیلی اور ہمارے بعض جلیل القدر رہنما مجبور ہوگئے کہ وہ ترکی کو بچانے کیلئے جو کچھ بھی اُن سے ہو سکے کر گزریں۔ اس موقعہ پر مولینا عبید اللہ سندھی کسی نہ کسی طرح سے بچ بچا کر ہندوستان سے کابل پہنچے۔ یہ ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے۔ اسکے پورے چوبیس برس بعد ۱۹۳۹ء میں مولینا واپس وطن لوٹے۔ اور آکر اپنے اہل وطن کو یہ پیغام دیا کہ محض وطن اور خاندان کی محبت مجھے اس عمر میں ہندوستان کھینچ نہیں لائی۔ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ زندگی کے معلوم نہیں کتنے دن اور ہیں۔ مجھے اگر آرام اور سکون کی خواہش ہوتی تو عمر کے یہ آخری دن حرم پاک کے جوار رحمت میں اطمینان سے گزارتا! اور اُس مقدس سرزمین میں سپرد خاک ہونا پسند کرتا۔ میں اس بڑھاپے میں اور اس قدر ضعف و ناطاقتی کے باوجود آپ لوگوں کے پاس صرف اس لئے پہنچا ہوں کہ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

آپ کے بزرگوں نے مجھے باہر بھیجا تھا۔ باہر رہ کر جو کچھ بھی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کر سکتا تھا میں نے کی۔ میں نے اس اثنا میں بہت کچھ دیکھا۔ اور عجیب غریب حالات سے مجھے گزرنا پڑا۔ میں جو کچھ تم سے کہنا چاہتا ہوں اُسے غور سے سنو۔ میں نے اپنی زندگی کے چوبیس برس ہندوستان سے باہر گزارے ہیں۔ اس طویل مدت میں میں نے محض ملکوں کی سیاحت نہیں کی اور چیزوں کو صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھا نہیں۔ بلکہ بڑی بڑی مہموں میں خود شریک رہا ہوں۔ اس جدوجہد میں کبھی اپنے ارادوں میں کامیاب رہا۔ تو اکثر بڑی تلخ اور جانگداز ناکامیوں کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔ مجھے سلاطین اسلام کے مشوروں میں شریک ہونے کا بھی موقعہ ملا۔ اور میں ان سپہ سالاروں کا رفیق بھی رہا، جو بڑی بڑی

سلطنتوں کے رکنِ رکین تھے۔ اور جنکے ہاتھوں دنیا کے عظیم الشان معرکے سر ہوئے۔ بادشاہوں اور سپہ سالاروں کے علاوہ میں جس ملک میں گیا اور جہاں بھی رہا میں نے وہاں کی ہر چیز آنکھیں کھول کر دیکھی۔ میں نے ان ملکوں کی پچھلی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ اور وہاں کے رہنے والوں کے موجودہ حالات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی۔ میرا یہ مطالعہ سرسری نہیں۔ اور میری باتوں کو تم وقتی تاثرات اور عارضی ہیجانات کا نتیجہ نہ سمجھنا۔ میری پیچھے تجربات اور مشاہدات کی ایک وسیع دنیا ہے۔ اور میں نے اقوام کی تاریخ کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش کی ہے۔ میرے حالات مجھ سے کرید کرید کر پوچھو۔ اور میرے نتائج کو توجہ سے سنو اور ان پر غور کرو۔ میں کوئی بات تم سے چھپانا نہیں چاہتا۔ میرا علم میرا مطالعہ، میرے تجربات اور میرے افکار وقفِ عام ہیں۔

مولینا نے فرمایا۔ میری آنکھوں نے زندگی کے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ میرے سامنے بڑی بڑی سلطنتیں تباہ ہوئیں۔ بادشاہ، سپہ سالار اور امرا بُری طرح قتل کئے گئے۔ وہ طبقے جو علم، حکمت اور عزت و دولت کے نشے میں ذہنی مسرتوں اور جسمانی آسودگیوں میں مست تھے، زمانے کی ایک ٹھوکر میں ذلت کے عمیق گڑھوں میں گرے ہوئے نظر آئے۔ اور نہ کوئی ان کے علم کا قدرداں رہا۔ اور نہ انکی عزت کا پرسان حال۔ میں نے پرانے تمدنوں کی بنیادوں کو اپنی نظروں سے کھدتے دیکھا۔ اور وہ نظام فکر جن کو ان کے ماننے والے لازوال جانتے تھے۔ اور انکی راہ میں ایک ذراسی تبدیلی انکو بہت گراں گزرتی تھی۔ میں نے ان نظاموں کے محترم و مقتدر علمبرداروں کو اپنے وطنوں سے دور محرومی و بےکسی میں دربدر خاک چھانتے دیکھا ہے۔ میں نے انسانی نسلوں کو فنا ہوتے، بستیوں کو اجڑتے، تمدنوں کو مٹتے اور مذہب و اہل مذہب کو بڑی سفاکی سے کچلے جاتے دیکھا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ وہ چیزیں جو مجھے دل و جان سے زیادہ

عزیز تھیں، اور جن کے لئے میں نے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا تھا، اُن چیزوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ختم ہوتے دیکھ کر مجھے کتنا دکھ ہوا! اور ان دردناک مناظر سے میرے دل و دماغ پر کیا گزری۔ بہر حال خدا تعالیٰ کی خاص عنایت تھی کہ اس قدر کرب اور اتنی اذیت جھیلنے کے بعد بھی میرے ہوش و حواس بجا رہے۔ اور میں زندگی کے ان انقلابات کو برابر دیکھا کیا، اور ان پر غور و خوض بھی کرتا رہا۔

مولانا نے فرمایا کہ میری خوش قسمتی تھی کہ جلاوطنی کے آخری ایام میں توفیق الٰہی مجھے دیارِ حرم میں لے آئی۔ اور وہاں میں تقریباً بارہ سال تک رہا۔ اس طویل مدت میں مجھے اپنے تجربات تاثرات، اور جو کچھ اس وقت تک دیکھا، پڑھا اور سنا تھا، ان پر یکسوئی سے غور کرنے کا موقع ملا۔ آپ لوگ یقین کریں کہ جہاں تک میری عقل اور سمجھ کی پہنچ تھی، میں نے اپنے افکار کو اس طویل مدت میں خوب جانچا، پرکھا، اور ان کے حسن و قبح میں تمیز کی۔ میں نے اپنے افکار کو جتنی بھی تاریخ میں جانتا تھا، اس کی کسوٹی پر اٹھیں کسا۔ خود اپنے تجربات کی روشنی میں ان کی صحت پرکھی اور جو کچھ علم دین، حکمت اور تقویٰ مجھے میسر تھا، اور اپنے مرشدوں اور استادوں کے فیض سے جو بھی بصیرت عطا ہوئی تھی، اپنے افکار کو ان کے روبرو پیش کرکے اپنے نفس کا بھی محاسبہ کیا، اور ان افکار کا بھی پورا پورا جائزہ لیا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جسے ہندوستان کے مسلمانوں کے اہل علم کا بہت بڑا طبقہ اپنا امام اور استاد مانتا ہے، اُن ایسے عظیم المرتبت عالم، حکیم، محدث، مجتہد اور خدا شناس بزرگ کے علم و حکمت کے ترازو میں میں نے اپنے ان افکار کو تولا۔ چنانچہ حرم اقدس کی برکتوں اور رحمتوں سے بھری ہوئی سرزمین میں ایک طویل عرصہ تک غور و تامل کرنے کے بعد جب مجھے اس بات پر

پورا اطمینان ہو گیا کہ جن افکار و خیالات اور طریق کار کی طرف میری جستجو نے میری رہنمائی کی ہے، اُس سے خدانخواستہ نہ تو میرے اسلام کو گزند پہنچے گا! اور نہ میری قوم کو اس کی وجہ سے کسی نقصان کا اندیشہ ہے۔ بلکہ مجھے اس پر پورا یقین تھا کہ اگر میرے وطن والے انھیں راہوں پر چلتے رہے، جن پر وہ اب تک چل رہے ہیں! اور جس عالم بے خبری میں وہ اب تک پڑے ہوئے ہیں، اسی عالم میں مست رہے۔ تو نہ تو ان کا اسلام بچ سکے گا اور نہ انکی قومی جمعیت اور ملی حیثیت برقرار رہ سکے گی جب مجھے اس حقیقت پر پورا یقین حاصل ہو گیا! اور اس یقین نے کچھ کرنے اور فکر کو عمل میں لانے پر مجبور کر دیا تو میں نے وطن واپس آنے کا تہیہ کر لیا۔ بیشک مجھے واپس وطن آنے کے لیے اپنے دشمنوں کے سامنے جھکنا پڑا لیکن میں نے اپنی طبیعت کے خلاف اس اعتراف شکست کے صدمہ کو برداشت کیا، کیونکہ اگر ایسا نہ کرتا تو کبھی بھی آپ لوگوں سے آج یوں باتیں نہ کر سکتا تھا! اور جو کچھ میرے دل و دماغ میں تھا اُسے میں ایک رازِ سربستہ کی طرح اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا! اور آپ لوگوں کو ان حقائق سے آشنا نہ کر پاتا جن تک خدا معلوم میں کن جسمانی مشقتوں ذہنی کاوشوں اور رجان کاہیوں کے بعد پہنچا تھا! اور جن میں میرے خیال میں آپ لوگوں کے لئے دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح تھی۔

مولینا نے فرمایا کہ میں ایک عالمگیر انقلاب کے سیلاب کو اپنی آنکھوں سے اٹھتا دیکھ آیا ہوں۔ انقلاب کے اس سیلاب نے کئی ایک ملکوں کو اپنی دار و گیر میں لے لیا ہے! اور جو ملک اب تک بچے ہوئے ہیں وہ بھی اس سیلاب کے ریلے سے زیادہ عرصہ تک محفوظ نہیں رہ سکینگے۔ یہ سیلاب موسمی جھکڑ نہیں کہ آیا اور نکل گیا۔ یہ عہد حاضر کے تاریخی تقاضوں کا قدرتی نتیجہ ہے انقلاب کا یہ سیلاب پیچھے ہٹنے والا نہیں۔ دیوارِ چین ہو یا سدِ تار ید، یہ سیلاب سب کو

خس و خاشاک کی طرح بہا کرلے جائیگا۔ دنیا ایک نئے طوفانِ نوح سے دوچار ہوا چاہتی ہے۔ بادل گھر چکے ہیں، گھٹائیں برسنے ہی کو ہیں۔ طوفانوں کو اٹھتے اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں نہ تو ان طوفانوں کی کچھ خبر ہے، اور نہ تم یہ جانتے ہو اگر یہ طوفان بہہ نکلے تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔ تمہارے علماء ہیں کہ ان کی نظریں محض پہلے کی لکھی ہوئی کتابوں میں پھنس کر رہ گئی ہیں۔ وہ اپنے گردوپیش دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اور اگر کبھی دیکھتے ہیں تو بس "کتابی" نظر سے۔ وہ زندگی سے کٹ چکے ہیں۔ اس لئے جن علوم کو وہ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ ان علوم میں اس بناء پر نہ تو خود کوئی زندگی کی رمق باقی ہے۔ اور نہ وہ علوم پڑھنے اور پڑھانے والوں میں زندگی کی حرارت اور تڑپ پیدا کرتے ہیں۔ تمہارے سیاست داں بڑی بڑی اسکیمیں بناتے ہیں، لیکن اُن کی نظر خاص طبقوں سے آگے نہیں بڑھتی، وہ قوم اور وطن کا نام لیتے ہیں، مذہب اور کلچر پر زور دیتے ہیں، لیکن ان کی قوم، وطن، مذہب اور کلچر کا تصور یا تو سرے سے موہوم ہے یا اُن کا اطلاق ایک خاص طبقہ کے اغراض و مصالح پر ہوتا ہے۔ یہ لوگ صرف اپنے آپ کی طرف دیکھتے ہیں، اور دل ہی دل میں یہ سمجھ لیتے ہیں کہ زمانہ ان کے اشاروں پر سدا حرکت کرتا رہے گا۔ اور لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان کی طرف ہی تکتے رہیں گے۔ اور قوم کے متوسط طبقے ہیں کہ انھیں روزمرہ کی مادی ضرورتوں اور رسمی مذہب کے چند معمولات سے جن سے انھیں تھوڑا بہت اطمینان مل جاتا ہے۔ کسی اور چیز سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ باقی رہے عوام قوم کا غالب حصّہ۔ قوم کے جسم کے ہاتھ اور پاؤں، ان کو تم نے "عوام کالانعام" کہہ کر صدیوں سے چارپایوں کے درجہ پر رکھ چھوڑا ہے۔ تم نے اپنی ایک محدود دنیا بنا رکھی ہے۔ اور اس دنیا میں تم شاداں و فرحاں ہو۔ اور کسی اور طبقے، قوم اور فکر اور

خیال کو خاطر میں نہیں لاتے تمہیں ساون کے اندھے کی طرح خیر سے اپنے اہلِ قلم "مجددین" اور "اصحاب امر" کے طفیل ہر طرف خزاں میں بھی ہریا دل ہی ہریاول نظر آتی ہے۔ بہار کا عہد کبھی کا گزر چکا، تم خوش اعتقادی میں اپنے ہاں اب تک بہار ہی کا عمل دخل دیکھ رہے ہو۔ دنیا میں زلزلے آرہے ہیں۔ لیکن تم گھروں کے اندر آنکھیں بند کئے پڑے ہو۔ زندگی کی قہرمانی قوتیں اپنی پوری شدت میں انسانیت کے بطن سے کرہِ آتش فشاں کی طرح پھوٹ نکلی ہیں۔ ان کے ہاتھوں پرانی دُنیا پر جو کچھ بھی گزرے کم ہے۔

مولینا نے فرمایا کہ جس آنیوالے انقلاب کی میں تمہیں خبر دے رہا ہوں میں یورپ کے ایک حصے میں اس انقلاب کو بروئے کار آتا دیکھ آیا ہوں۔ اس انقلاب نے اس سرزمین کی جس طرح کایا پلٹ کی اور غالب گروہ نے جس سفاکی سے اپنے حکمرانوں کو تہ تیغ کیا میں اسکے اسباب اور نتائج خوب سمجھ چکا ہوں لیکن یہ انقلاب بس اسی ملک تک محدود نہیں رہیگا۔ یہ عالمگیر انقلاب ہے اور یہ ساری انسانیت کو ایک نہ ایک دن اپنی لپیٹ میں لے کر رہے گا۔ اور تو اور برطانیہ والے جن کی آج ہمارے ملک پر حکومت ہے خود انکے اپنے وطن میں اس انقلاب کے سوتے پھوٹ رہے ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں کہ برطانیہ کے حکمراں طبقوں کے لئے خود اپنوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ تم اس انقلاب کی قوت، وسعت، شدت اور سفاکی اپنی موجودہ زندگی میں محسوس تک نہیں کر سکتے۔ اس انقلاب کو قیامت سے کم نہ سمجھو۔ یقیناً یہ "حشر" برپا کر کے رہے گا تاکہ انسانیت کے لئے خدائے ذوالجلال کی طرف سے ایک نئے "نشر" کا سامان ہو سکے۔

ہوا یہ کہ انسانیت کی بڑی تعداد کو اب تک ایک گروہ نے دبائے رکھا۔ یہ مختصر گروہ کُل

قوت اور اقبال کا مالک تھا! انسانیت کی یہ بڑی تعداد کسان اور مزدور کماتے! ور اور یہ کا مختصر گروہ انکی کمائی کو اپنا حق سمجھتا۔ جو کماتے تھے، ان کو کھانے کو نہ ملتا! ور جو ان کی کمائی پر رہتے تھے، وہ کمانا ذلت کا نشان سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ "کماؤ" طبقے پس ماندہ اور ذلیل ہو گئے! ور "کھاؤ" طبقے دولت اور اقتدار کے نشہ میں انسانی اخلاق سے گزر گئے۔ اور مجموعی طور پر ساری انسانیت کو گھن لگا غضب یہ ہوا کہ اس دور میں علم، کلچر اور مذہب کے جو معیار رہے اُن کے پیش نظر بھی بس اسی مختصر گروہ کی خوشنودی رہا! ان سے اگر سکون و اطمینان ملتا تو زیادہ تر ان لوگوں کو اور ذہن کی جلا ہوتی تو انکی! ور تمدن و تہذیب کی برکتیں پھیلتیں تو صرف ان کے گھروں یا محلوں تک۔ کسانوں اور مزدوروں کو اتنی مشقت کرنی پڑتی تھی کہ انھیں کسی بات کا ہوش بھی نہ رہتا! ور اگر کبھی کبھار انکے شعور کی آنکھیں کھل جاتیں تو انھیں سُلانے کے لئے خواب آور دواؤں کی کمی نہ تھی۔ زمانہ مدتوں اسی طرح چلتا گیا اور محنت کش طبقے نسلاً بعد نسلاً اپنے بھائیوں کے ہاتھ سے یہی دُکھ اٹھاتے رہے لیکن ظلم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آئی۔ اور اس سے اپنے بندوں کی یہ بُری حالت زیادہ دیر دیکھی نہ گئی۔ چنانچہ انسانی ذہن کو یہ توفیق عطا ہوئی کہ وہ مشین ایجاد کرے۔ اس مشین سے صنعت و حرفت کا دور شروع ہوتا ہے۔ بیشک یہ دور بھی اپنے ساتھ بہت سی مصیبتیں ساتھ لایا اور مشینوں کو چلانے والوں پر سالہا سال تک مشینوں کے مالکوں نے بڑے بڑے ستم توڑے۔ لیکن اب یہ مشینیں مزدوروں کے ہاتھوں میں ایک بے پناہ قوت کا ذریعہ بن گئی ہیں! ور آہستہ آہستہ یہ مزدور متحد اور منظم ہو رہے ہیں! ور آگے چل کر یہ ہوگا کہ زمین پر کام کرنے والے کسان بھی ان کے ساتھ مل جائیں گے۔

یہ انقلاب جسے میں اپنی آنکھوں سے برسرِ کار دیکھ آیا ہوں، انسانیت کے ان پسماندہ طبقوں کو للکار رہا ہے کہ اٹھو! غاصبوں سے اپنا حق چھینو۔ اور جو ظلم پر جی رہے ہیں، انھیں نیست و نابود کر دو۔ اس انقلاب کا نعرہ یہ ہے کہ مزدورو اور کسانو! محنت کشو! مستقبل تمہارا ہے۔ تم محنت کرتے ہو۔ اور تمہاری محنت ہی کا نتیجہ یہ سربفلک عمارتیں، رزق کی یہ فراوانی، آرام و آسائش کے یہ ذرائع، اور دنیا کی یہ ساری ثروت اور دولت ہے، جس سے تم اب تک محروم رکھے گئے ہو۔ دراصل یہ کل متاع تمہاری ہے۔ اٹھو اپنے آپ کو منظم کرو۔ آگے بڑھو! اور جو تمہارا حق ہے، اس پر قبضہ کر لو۔ اس میں جو شخص اڑے آئے اُسے مٹا دو۔ جو علم، کلچر، مذہب اور اخلاق تمہارے سدِ راہ ہو، اس کا انکار کر دو۔ وہ علم ناقابل اعتبار ہے۔ وہ کلچر بے کار اور فرسودہ ہے۔ وہ مذہب غلط ہے! اور اخلاق کا وہ نظام بے معنی ہے۔

مولٰینا نے فرمایا کہ اس انقلاب نے اپنا ایک فلسفہ بھی وضع کیا ہے۔ اس فلسفے سے محنت کشوں کو ایک ایسا حربہ ہاتھ آگیا ہے جس کا توڑ بڑے بڑوں سے بھی مشکل سے بن آتا ہے۔ اس فلسفے کی نظری حیثیت جو کچھ بھی ہے، وہ تو ہے ہی لیکن عملاً اس کا مقابلہ اس لئے بھی مشکل ہے کہ گو انقلاب کا یہ فلسفہ خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے لیکن اس کا دعویٰ اور کوشش یہ ہے کہ ساری کی ساری خلقِ خدا بغیر کسی رنگ، نسل، ملک یا مذہب کی تمیز کے آزادی، مساوات اور اقتصادی خوش حالی کی نعمتوں سے یکساں فیضیاب ہو۔ یہ فلسفہ مظلوموں کو انصاف کی امید دلاتا ہے۔ اس سے ذلیل اور پسماندہ انسان عزت و اقبال کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ کم ہمتوں میں جرأت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے! اور اتفاق یہ ہے کہ آج اس زمانے میں، ان مظلوموں پسماندوں اور کم ہمتوں ہی کی کثرت ہے! اور خدا کی بیشتر مخلوق دکھوں اور روگوں ہی میں

گرفتار ہے۔

مولینا نے بتایا کہ اگر تم نے اپنے ملک کے تباہ حال اور بیکس طبقوں کی خبر نہ لی! ور انھیں اس حال میں رہنے دیا جس میں کہ وہ صدیوں سے جان توڑ رہے ہیں! ور تمہارے اوپر کے طبقے حسب سابق جونک بن کر ان کا خون چوستے رہے! ور ان کو تم نے اب بھی اسی بھوک، جہالت ذلت اور عفونت کی دلدلوں میں بدستور مرنے سڑنے دیا تو یاد رکھو کہ انقلاب کا یہ لادینی فلسفہ جو آگ کی طرح ساری دنیا میں پھیل رہا ہے۔ تمہارے ملک کے ان بد نصیب طبقوں، کو دوسرے ملکوں کی طرح تمہارا جانی دشمن بنا دیگا! ور اگر تمہاری غفلت سے ان کی دشمنی کی آگ بھڑک اٹھی۔ تو اس کے شعلے تمہیں تو جلا کر خاک سیاہ کریں گے ہی لیکن اس کے ساتھ تمہارے علم کلچر اور مذہب کی بھی خیر نہ ہو گی۔

مولینا نے فرمایا کہ اس قسم کے انقلاب! ور اس کے لادینی فلسفہ کے ہولناک نتائج سے بچنا چاہتے ہو تو انقلاب کے کسی ایسے دینی فلسفہ کو اختیار کرو۔ جس کے ذریعے تم خدا کو مانتے ہوئے خدا کی مظلوم مخلوق کو خوش حال بنا سکو۔ انسانیت اب زیادہ دیر تک ظلم نہیں سہہ سکتی۔ اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ اگر لادینی فلسفۂ انقلاب کے علمبردار اپنے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ پس ماندہ انسانیت کو نئی زندگی کی دعوت دیتے ہیں تو تم ساری انسانیت کو خدا کی ایک سی مخلوق ماننے والے اور اُسے ہر ذی روح کا رازق اور رب جاننے والے کوئی ایسا فکر کیوں پیش نہیں کرتے، جس سے اس کی ساری مخلوق کی بھلائی ہو۔ ہر ظلم مٹ جائے۔ ہر حق دار کو اس کا حق ملے۔ ذلت و نکبت کا خاتمہ ہو! ور کوئی بندہ اپنے

رکھے دیئے ہوئے رزق سے محروم نہ کیا جا سکے۔ اور جس طرح ایک خاندان کے سب افراد آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، اسی طرح مجموعی انسانیت جس کی حیثیت فی الواقعہ "عیال اللہ" کی ہے، اللہ کی نعمتوں سے یکساں متمتع ہو۔

مولینا نے اپنے اہل وطن کو بتایا کہ میں انقلاب کے اس قسم کے دینی فلسفہ کا پیغام بن کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ انقلاب کا میرا یہ پیغام تمہیں لادینی انقلاب کے مضرت بخش اثرات سے محفوظ رکھ سکے گا۔ محنت کش طبقوں کے ہاتھ میں قوت اور اقتدار کا آنا یقینی ہے۔ تم نے اگر محنت کشوں کے اس انقلاب کو دینی نہ بنایا، تو پھر یہ انقلاب حتمی طور پر لادینی فلسفہ کے ذریعہ ہوگا۔

الغرض چوبیس برس کی جلاوطنی کے بعد مولینا واپس لوٹے تو اس انقلاب کے نقیب اور داعی بن کر لوٹے۔ انقلاب کے اس دینی فلسفہ پر انھیں یقین حاصل ہو چکا تھا کہ یہ لادینی فلسفۂ انقلاب سے انسانیت کے حق میں زیادہ مفید اور زیادہ پائدار ہے۔ مولینا نے لادینی انقلاب کے عملی مظاہر اور اس کے نتائج کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور ایک مخالف نہیں۔ بلکہ ایک ہمدرد اور دوست کی نظر سے دیکھا تھا۔ اس لادینی فلسفہ کے ذریعہ دنیا میں ایک بہت بڑا انقلاب کرنے والوں سے ان کا ربط ضبط بھی رہ چکا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے ان کے دل اور دماغ نے انقلاب کے اس لادینی فلسفہ کو ہر حیثیت سے بے نقص اور مکمل ماننے سے سختی سے انکار کر دیا۔ بے شک وہ اس لادینی انقلاب کو دیکھ کر خود اپنے ملک کے لئے اسی قسم کے ایک ہمہ گیر کلی اور اپنی پوری وسعتوں کو لئے ہوئے انقلاب کے دل، وجان سے حامی تو ہو گئے۔ اور انہوں نے اسی دن سے اس انقلاب کو بروئے کار

لانے کے لئے تدبیریں سوچنی شروع کردیں۔ لیکن وہ کسی طرح بھی اس انقلاب کے لادینی فلسفہ کے قائل نہ ہو سکے۔ یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ مولینا کا یہ سارا انقلاب کہیں سفر روس کے تاثرات کا تو ردِ عمل نہیں، اس شبہ کے بارے میں ہم صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ مولینا کی طبیعت، ان کا مزاج، اور جن طبعی عناصر سے ان کے وجود کی ترکیب عمل میں آئی، اور پھر ان کا بچپن کا ماحول، اور بعد میں جن بزرگوں سے انہوں نے تعلیم پائی۔ اور دیوبند چھوڑنے کے بعد سندھ میں جن جن حالات سے ان کو سابقہ پڑا، اور سندھ سے واپس دیوبند آکر جمیعت الانصار کے کاموں کے سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ دیکھا، اور آخر میں افغانستان میں بادشاہی درباروں، امراء و وزراء کی مجلسوں اور بڑے بڑوں کی زندگیوں سے جو تلخ سبق انہوں نے سیکھا تھا اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ روس میں داخل ہونے سے قبل ہی ان تجربات اور مشاہدات نے انھیں شاہ ولی اللہ صاحب کے مشہور تاریخی خواب کے اس جملے "فَکُّ کُلِّ نظام" یعنی اس وقت ہر پرانے نظام کو توڑدو، کا قائل کر دیا تھا، اور وہ ان اثرات کی بنا پر پورے انقلابی بن چکے تھے۔ بیشک وہ روس کے انقلاب سے بھی متاثر ہوئے لیکن صرف اس حد تک کہ اس کی مدد سے انہوں نے اپنے انقلابی فکر کو موجودہ حالات کے مطابق ایک منطقی ترتیب دی، اور اسے عمل میں لانے کیلئے راہیں اور طریقے سوچے۔

انقلاب کا یہ پیغام جس کے اب مولینا نقیب بنے، مختصر الفاظ میں ان کی اپنی انقلابی طبیعت ان کے انقلابی ماحول، اور ان کی انقلابی تعلیم اور برسوں کے تجربات کا لازمی نتیجہ تھا۔ خدانخواستہ مولینا کی یہ دعوتِ انقلاب محض روس کے انقلاب کی

صدائے بازگشت نہیں! انقلاب کی یہ تڑپ مولینا کے اپنے دل کی گہرائیوں سے اٹھی تھی اور انقلاب کا یہ فکر خود انکے اپنے ذہن کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے اس انقلابی فکر کو اپنے علم اور مطالعہ کی بھٹی میں برسوں تک تپایا۔ اور اپنے تجربات کی روشنی میں اس فکر کے ان پہلوؤں کو جنکی زندگی ایک ابدی حیثیت ہے ہنگامی اثرات سے جدا کیا۔

.... اور جب انھیں اپنے اوپر پورا وثوق ہو گیا تو اپنے اہل وطن کے پاس اس انقلاب کا پیغام لے کر آئے، اور انھیں بتایا کہ تمہارے محنت کش طبقے لادینی انقلاب کے ذریعے اٹھے تو اس سے تمہارے دین کا جو حشر ہوگا، وہ تو معلوم ہی ہے۔ لیکن اس کا اثر تمہارے قومی وجود کے لئے بھی زیادہ مفید نہیں ہوگا۔ اس لادینی انقلاب کا مرکز تمہارے ملک سے باہر ہے۔ اگر اس مرکز کے لادینی انقلاب کی رو میں تم بہہ گئے تو اگرچہ یہ مان بھی لیا جائے کہ تم سیاسی طور پر آزاد و خود مختار ہو گے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ذہنی طور پر تم اوروں کے مقلد ہو جاؤ گے۔ تم دوسروں کے الاپے ہوئے راگ گا کر خوش ہو گے۔ زبانیں تو بیشک تمہاری ہوں گی۔ لیکن تم باتیں دوسروں کی کیا کرو گے۔ ان کے حسن کو حسن سمجھو گے! ور جس چیز کو کسی وجہ سے انہوں نے برا کہا ہے اس کو بے سوچے سمجھے برا کہنے لگو گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری اپنی شخصیت تکمیل پذیر نہیں ہو سکے گی! ور تمہارا قومی وجود فکر اور عمل کی بھرپور زندگی سے محروم رہے گا۔ اس کی وجہ سے تمہیں اپنے اوپر پورا اعتماد نہ ہوگا! ور تم خود اپنی نظروں میں بے وقر ہو جاؤ گے۔ اور تمہاری تاریخ، تمہاری قومی روایات اور تمہارا علمی و فکری اثاثہ تمہارے لئے دوسرے درجہ کی چیز ہو کر رہ جائے گا۔ اس سے تم دوسری قوموں کے مقابلہ میں سبک سر ہو جاؤ گے

آنے والے انقلاب کے ان نتائج بد سے بچنا چاہتے ہو تو خود اپنے قومی ضمیر سے انقلاب کا فکر پیدا کرو۔ اور اس انقلابی فکر کا اپنی تاریخ سے ڈھانچہ بناؤ۔ اس سے یہ ہوگا کہ ایک، تو تم دوسروں

کی دیکھا دیکھی تقلیداً انقلابی نہیں بنو گے! اور دوسرے تمہارا انقلاب تمہارے عام اہلِ وطن کے لئے ایک اعجوبہ بن کر نہیں رہ جائے گا۔ بلکہ انقلاب خود تمہارے باطن سے پھوٹے گا۔ وہ تمہارے اپنے طبعی تقاضوں کا نتیجہ ہو گا! اور اس کی شکل اور ہیئت ملک کے حالات اور اس کی روایات کے مطابق ہو گی! اور اس کی صورت یہ ہو کہ خود اپنی تاریخ سے انقلاب کی روح اخذ کرو! انقلاب کا فکر اور عمل کسی خاص ملک، کسی خاص قوم اور کسی خاص مذہب کا اجارہ نہیں۔ انقلاب اتنا ہی ہمہ گیر ہے جتنی کہ خود زندگی ہے۔ تم زندگی کی فعال قوتوں سے انقلاب کا سبق سیکھو! اور اپنی تاریخ کے انقلابی ادوار کو اپنا مطمح نظر بناؤ۔ جو اس میں غیر انقلابی زمانے دیکھتے ہو، انہیں چلتے ہوئے کارواں کی گردِ راہ سمجھو۔ مولینا کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح سے تمہارے ملک میں جو انقلاب آئے گا، مجھے پورا یقین ہے کہ وہ روس کی طرح کا لادینی انقلاب نہیں ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ انقلاب نام نہاد مذہب کی مخالفت کرے۔ اور شاید بعض مذہبی طبقے اسے بھی بزعم خود لادینی انقلاب ہی کا نام دیں۔ لیکن یہ انقلاب صحیح معنوں میں مذہب کے اصل مقصد کا ترجمان ہو گا۔ یہ دینِ حق کا انکار نہیں کرے گا! البتہ جو لوگ دین کے نام سے خلقِ خدا کو لوٹنے کھسوٹنے کی اجازت دیتے ہیں، ان کے حق میں یہ انقلاب لادینی انقلاب سے کچھ کم سخت گیر نہیں ہو گا۔ مولینا کے نزدیک اس دینی انقلاب کا سب سے بڑا سرچشمہ قرآن کریم ہے جو تمام الہامی کتابوں کی انقلابی تعلیمات کے اساسی اصولوں کا حافظ اور جامع ہے۔

قرآن کریم کے اس فلسفۂ انقلاب کو معین کرنے میں مولینا کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی دلیلِ راہ بنے! اور شاہ صاحب کی تعلیمات، ان کی حکمت! اور ان کے طریقہ کار کی روشنی

میں موصوف نے قرآن کو کل نوعِ انسانیت کے لئے انقلاب کا ایک پیغام اور سُنت کو اس انقلاب کی عملی تاریخ سمجھا! اور ان پر یہ حقیقت کُھلی کہ انسانیت کے پس ماندہ طبقوں کو اٹھانے کے لئے ضروری نہیں کہ انقلاب ہمیشہ لادینی اصولوں پر ہو۔ بلکہ صحیح راہ عمل یہ ہے کہ خدا کے وجود کا انکار کئے بغیر انسانوں میں انقلابی فکر اور انقلابی عمل پیدا کیا جائے! انقلاب کا یہ دینی تصور مولٰینا کے نزدیک محض مسلمانوں کی مذہبی کتاب اور ان کی ملی تاریخ تک محدود نہیں۔ اس فکر میں اتنی وسعت ہے کہ انجیل، تورات اور گیتا کے ماننے والے بھی اس قسم کا انقلاب سوچ سکتے ہیں۔

ممکن ہے بعض معترضین یہ فرمائیں کہ ہم کتاب و سُنت کے عالم ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابیں ہم نے بھی پڑھی ہیں۔ لیکن جو باتیں مولٰینا عبید اللہ صاحب سندھی کتاب و سُنت کی انقلابی تعلیمات اور شاہ ولی اللہ کی انقلابی حکمت کے متعلق کہتے ہیں وہ ہمیں تو ان کتابوں میں کہیں لکھی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ آخر یہ معمہ کیا ہے؟ ان بزرگوں کی خدمت میں ہم یہ عرض کریں گے کہ آپ حضرات کو اس بات سے تو شاید انکار نہ ہوگا کہ مولٰینا بھی کتاب و سُنت کے بہت بڑے عالم تھے! اور ان کی ساری زندگی قرآن مجید کے مطالعہ اور اس کے حقائق کو سمجھنے میں گذری! اور اس راہ میں انہوں نے کبھی کسی جسمانی تکلیف، اور دماغی مشقت کی پروا نہ کی۔ اور آپ کو اس کا بھی علم ہوگا کہ موصوف نے علم حدیث و فقہ کی تحقیق میں بھی زندگی کا ایک معتدبہ حصہ صرف کیا تھا۔ پھر فلسفہ و حکمت پر بھی وہ غائر نظر رکھتے تھے! اور تصوف کے تو وہ شخص عالم نہ تھے بلکہ انہوں نے بزرگوں کی صحبت میں رہ کر سلوک کی باقاعدہ منزلیں طے کی تھیں! اور اپنے بزرگوں اور استادوں کے ساتھ ان کی عقیدت اور وارفتگی کا یہ عالم تھا!

کہ جس مرشد نے بچپن میں سب سے پہلے ان کو کلمۂ توحید کی تلقین فرمائی تھی، زندگی کے آخری دنوں تک جب کبھی اس مرشد کا نام ان کی زبان پر آتا، تو فرطِ محبت میں مولینا پر رقت طاری ہو جاتی اور آنکھیں بے اختیار پُرنم ہو جاتیں! اور جس استاد سے انہوں نے کتاب و سنت کی تعلیم پائی تھی، اس پاک نفس بزرگ کے ارشادات کی تعمیل میں، انہوں نے اپنی ساری زندگی جان جوکھوں میں کاٹی۔ وطن سے بے وطن ہوئے، پردیس میں مارے مارے پھرے۔ ذلتیں برداشت کیں بھوکے رہے۔ کوڑی کوڑی کے محتاج ہوئے، اس استاد سے ان کی فریفتگی کا یہ عالم تھا کہ آخر وقت میں بسترِ مرگ پر پڑے ہیں۔ اور جب جان لینے والا فرشتہ آکر دستک دیتا ہے تو انہیں اپنے مرحوم و مغفور استاد کے نام کو زندہ رکھنے کے سلسلہ میں "یادگارِ شیخ الہند" اور "محمود نگر" کے متعلق تدبیروں میں مصروف پاتا ہے۔

کتاب و سُنت کے مطالعہ و تحقیق سے اتنی وابستگی، اور ان کی تعلیم دینے والوں سے زندگی کی آخری ساعت تک اس قدر شیفتگی اور عقیدت۔ یہ جانتے ہوئے کسی معترض کا یہ کہنا کون باور کرے گا کہ مانا مولینا کی زبان و قلم پر تو بے شک کتاب و سُنت کا ذکر آتا ہوگا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے دل اور دماغ "نعوذ باللہ" کسی اور وادی میں بھٹک چکے تھے! اور وہ محض زمانہ سازی کے طور پر یا اپنی کسی مصلحت کے خیال سے کتاب و سُنت کے ذیل میں ایسی باتیں کہا کرتے تھے۔ مولینا عبید اللہ صاحب سندھی کے متعلق جو شخص یہ کہتا ہے، سچی بات یہ ہے وہ مولینا کے مزاج اور ان کی طبیعت سے بالکل ناواقف ہے۔ ورنہ اگر مولینا کی زندگی پر اُس کی نظر ہوتی تو وہ بآسانی سمجھ لیتا کہ مولینا جیسی طبیعت والے آدمی کے لئے سالہا سال تک اس طرح کی دورخی زندگی گزارنا ممکن تھا، اور نہ انھیں، اس کی مطلق ضرورت تھی۔ وہ خدانخواستہ

اگر کتاب وسنت کو خیر باد کہہ کر حقیقۃً دوسری وادی میں قدم رکھ چکے ہوتے۔ تو وہ اس کا کھلے بندوں اعلان کرتے۔ اور اس کے صلے میں ایک دنیا انکی پیشوائی کو آگے بڑھتی اور عظمت اور دولت انکے قدم چومنے کو حاضر ہوتی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ہمارے خیال میں انھیں اس میں زیادہ دقت بھی نہ ہوتی۔ کیونکہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر بچپن ہی میں دنیا کی سب سے بڑی متاع یعنی بیوہ ماں کی محبت، جاں نثار بہنوں کی عقیدت اور گھر کا آرام اور سکھ چھوڑ چکے تھے۔ اور اسکے بعد بھی بار ہا اپنے ذہن اور عمل کی یک رنگی کی خاطر انہوں نے بڑے بڑے مناصب سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ انہوں نے زندگی میں اشارۃً بھی کبھی کتاب وسنت سے اپنی ذراسی بے تعلقی کا بھی اظہار نہیں فرمایا۔ بلکہ اس کے خلاف ان کی زندگی کے آخری دنوں میں راقم السطور جب خدمت میں حاضر ہوا تو وصیت کے طور پر اُسے فرمایا کہ " قرآن کی محبت دل میں جاگزیں کرو۔ اُسے اپنے فکر و عمل کا اساس بناؤ۔ اور پھر زندگی کے مسائل کو سوچو، سمجھو، اور ان کو سلجھاؤ۔ ہوا یہ کہ کچھ لوگوں نے پہلے تو قرآن کی جلدیں باندھیں پھر اُسے غلافوں میں لپیٹا۔ ہم ان غلافوں کو چاک کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ان جلدوں کو پھاڑ دیں گے تاکہ قرآن جیسا وہ ہے لوگوں کے پاس پہنچے، اپنی اصلی شکل میں، بالکل واشگاف و بے نقاب، لوگ اُسے پڑھیں۔ اور اپنی زندگی میں اُسے مشعلِ راہ بنائیں۔"

ہماری ان معروضات کے باوجود اہلِ علم کا ایک ایسا گروہ پھر بھی موجود رہے گا جو اس بات پر مصر ہوگا کہ مولینا کے انقلابی فکر اور ان کی انقلابی تعلیمات کی سند چونکہ ہم کتاب وسنت کے صحائف میں نہیں پاتے۔ اس لئے ہم مولینا کی دعوت کو اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ان واجب الاحترام اہلِ علم کی خدمت میں عرض ہے کہ آپنے اور سب لوگوں نے دیکھا

ہے کہ مولینا جو کچھ فرماتے اور لکھتے تھے۔ اس میں ایک بات کا وہ بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کا دستور یہ تھا کہ کتاب و سنت کے حوالے سے جو بات بھی کہتے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ضرور بتا دیتے کہ یہ نتیجہ میں نے شاہ ولی اللہ صاحب کی فلاں کتاب کی فلاں عبارت سے استنباط کیا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسی بات کہتے، جس کے لئے انھیں شاہ صاحب کی کتابوں سے سند نہ ملتی تو صراحت کر دیتے کہ یہ میرا ذاتی اجتہاد ہے۔ میں اس کے منوانے کے لئے مصر نہیں۔ جو چاہے مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے۔ ہمارے خیال میں آپ حضرات کو اس بات سے تو شاید انکار نہ ہوگا کہ مولینا عبید اللہ صاحب شاہ ولی اللہ کے علوم اور ان کی حکمت میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے اور آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ولی اللہی علوم ساری عمر ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا رہے۔ اس سلسلہ میں مجلہ "الفرقان" (بریلی) کے صفحات پر مولینا سید سلیمان صاحب ندوی کا یہ ارشاد گرامی ہم نے دیکھا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ "مولینا سندھی کے مضمون کو میں نے بغور پڑھا اور اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ بیشک مولینا کی نظر حضرت شاہ صاحب کے فلسفے اور نظریات پر نہایت وسیع ہے"۔ اس کے علاوہ "الفرقان" کی اسی اشاعت میں مولینا منظور صاحب نعمانی نے بھی مولینا کے متعلق لکھا تھا "........ ولی اللہی حکمت پر مولینا کی نظر کس قدر گہری ہے اور شاہ صاحب کے علوم و معارف کا انہوں نے کس قدر عمیق مطالعہ فرمایا ہے"۔ قارئین خود ہی انصاف فرمائیں کہ ان شہادتوں کے بعد کسی صاحب کا یہ کہنا کہ مولینا خدا نخواستہ شاہ صاحب کو سمجھ نہیں سکے۔ یا انہوں نے جان بوجھ کر شاہ صاحب کی باتوں کا غلط مطلب لیا، کس قدر ظلم ہوگا۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بعض اہل علم یہ کہیں کہ شاہ ولی اللہ صاحب ہمارے لئے حجت

نہیں۔ ہم تو کتاب و سنت کو براہِ راست مانتے ہیں۔ ہمیں تو صرف کتاب و سنت کی سند چاہئیے۔ ان اہل علم سے ہم یہ عرض کریں گے کہ اگر واقعی آپ لوگوں کا نقطہ نظر یہی ہے جو آپ نے ابھی فرمایا تو آپ یقین کریں کہ مولینا کو خود اس بات کا اعتراف تھا کہ وہ آپ کے مسلک کے اہل علم حضرات کو اپنی بات منوانے سے قاصر ہیں۔ آپ بڑی خوشی سے صرف کتاب و سنت کو اپنا دلیل راہ بنائیے! اور آپ کو پوری اجازت ہے کہ اس سلسلہ میں کسی عالم اور محقق کو واسطہ نہ مانئیے۔ جہاں تک مولینا کی دعوت کا تعلق ہے، وہ تو صرف ان اہل علم کو اپنا مخاطب بناتے تھے، جو ان کی طرح شاہ ولی اللہ اور ان کے سلسلہ کے اساتذ کو اپنا امام اور پیشوا مانتے ہیں۔ مولینا دیوبندی تھے! ور ہندوستانی علماء کی دیوبندی جماعت کی طرف ہی اس معاملہ میں زیادہ تر ان کا روئے سخن رہا۔ بے شک علمائے "اہل حدیث" کے بارے میں بھی کبھی کبھی وہ کچھ فرمایا کرتے تھے۔ لیکن اس سلسلہ میں صرف وہ اتنا کہتے کہ آپ لوگ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کو تو مانتے ہیں، لیکن جس سرچشمہ سے ان دونوں بزرگوں کو فیض ملا! اور جس تحریک کے یہ دو اولوالعزم رکن تھے، تم نے اسکی صحیح اہمیت سمجھنے کی کوشش نہ کی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تم باہر کے افکار اور خیالات سے متاثر ہو کر غلط فہمی میں پڑ گئے! اور تم نے ولی اللہی تحریک کی بجائے جو دیوبندی اور اہلحدیث دونوں جماعتوں کا اصلی مرجع اور مدار تھا، نجدی اور یمنی تحریکوں کو اقرب الی الصواب بنا لیا۔ جس کی وجہ سے تقلید اور عدم تقلید کے بے معنی اور بے نتیجہ جھگڑے پیدا ہو گئے۔ اور دونوں گروہوں میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے اور تمہارے دونوں کے بزرگوں کی برسوں کی محنتیں اور قربانیاں یوں ہی رائیگاں گئیں۔

اور گزشتہ صدیوں میں شاہ ولی اللہ، شاہ عبد العزیز، سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید رضوان اللہ علیہم نے اس ملک میں اسلام کو ایک زندہ، فعال اور صاحب اقتدار قوت بنانے کے لئے جو جد و جہد کی، اس کا نتیجہ پیہم ناکامیوں کے سوا کچھ نہ نکلا۔

مختصراً مولٰینا تو اس خاص معاملے میں کتاب و سنت اور شاہ ولی اللہ کے نام سے علماء کی صرف ان جماعتوں کو دعوت دیتے ہیں جو مولٰینا کی طرح کتاب و سنت کو تو مانتے ہی ہیں لیکن کتاب و سنت کو سمجھنے کیلئے شاہ ولی اللہ اور انکے سلسلے کے استادوں کو بھی اپنا واسطہ بناتے ہیں۔ اب جو لوگ شاہ صاحب اور ان کے سلسلہ کے واسطے کے سرے سے قائل ہی نہیں، ظاہر ہے مولٰینا کے لئے ان کو اپنی بات سمجھانا بڑا مشکل ہے۔ لیکن اگر اہل علم کے اوپر کے گروہ ہی میں سے کوئی صاحب یہ کہیں کہ ہم نے کتاب و سنت کو پڑھا ہے اور شاہ صاحب کے علوم کا بھی احاطہ کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں قرآن کی انقلابی تعلیم اور شاہ صاحب کی انقلابی حکمت کا کہیں سر پتہ نہیں ملا۔ تو اس کے جواب میں مجبوراً یہی عرض کرنا پڑے گا کہ محترم بزرگوار پڑھنے پڑھنے میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ بیشک آپ نے یہ سب کچھ پڑھا، ہمیں اس سے مجال انکار نہیں۔ لیکن آخر اس سے بھی تو انکار نہیں ہو سکتا کہ مولٰینا نے بھی کتاب و سنت کو پڑھا تھا اور انہوں نے جیسا کہ سب کو تسلیم ہے شاہ صاحب کی حکمت پر برسوں غور کیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ مولٰینا اپنے مطالعہ و فکر کے ذریعہ جن نتائج اور حقائق تک پہنچے، آپ کیوں ان تک نہیں پہنچ سکے؟ تو اس ضمن میں ہماری صرف اتنی گزارش ہے کہ مثال کے طور پر آپ انسان کی نظر کو لیجئے۔ نظر کا کام دیکھنا ہے۔ اور بالعموم ایک آدمی کی نظر دوسرے آدمی کی نظر سے اپنی طبعی خصوصیات

میں زیادہ مختلف نہیں ہوتی۔ لیکن یہ تجربے کی بات ہے کہ ایک چیز کو ایک وقت میں دو آدمی دیکھتے ہیں، تو ایک خوشی اور انبساط سے بھر جاتا ہے اور دوسرے پر درد وکرب کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی آدمی ایک وقت میں ایک چیز کو مرغوب اور دلکش پاتا ہے۔ اور دوسرے وقت میں یہی چیز اُسے مکروہ لگتی ہے۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ جب انسانی نظر جیسی مادی چیز کا یہ حال ہے کہ مختلف حالات وکوائف میں اس کے اثرات اس قدر مختلف ہوسکتے ہیں، تو فرمائیے جب معاملہ ہو الگ الگ طبیعتوں کا، جدا جدا خاندانی حالات کا، پھر ایک دوسرے کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہو۔ اور بعد میں ایسے حالات رونما ہوں کہ ایک تو جس فضا میں اس نے جنم لیا ہو، اسی میں اطمینان سے اپنی زندگی گزار دے۔ اور دوسرے کو ساری عمر زمانے کے طرح طرح کے انقلابات سے سابقہ پڑے۔ کیا اس صورت میں ان مختلف اشخاص کی معنوی زندگی میں بہت بڑا فرق نہیں ہوگا۔ اور یہ لوگ مشاہدہ اور نظر کی حد سے آگے بڑھ کر جب مطالعہ وفکر کی حدود میں داخل ہوں گے تو کیا یہ یقینی امر نہیں کہ ایک کی فکری جستجو اور قلبی بصیرت ایک ہی کتاب کے مطالعہ سے اس پر حقائق ومعارف کی ایک وسیع دنیا بے حجاب کردے، اور دوسرے کی نظر الفاظ کے ٹھوس مفہوم سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ہماری تاریخ میں اب تک ایسا ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ایسا ہوتا رہے گا۔ اسلام کے مابعد الطبیعاتی مسائل میں یہ ہوا ہے۔ اور خود احکام کے فرقِ مراتب پر بھی اس کا اثر پڑا ہے۔ اسی بنا پر علم کلام کے مختلف خیال بنے۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ متعدد فقہی مذاہب وجود میں آئے۔ حنابلہ نے تاویل کی مطلق ممانعت کردی۔ بعض ائمہ نے تاویل کی مشروط

اجازت دی۔ معتزلہ کا فرقہ پیدا ہوا۔ اشعریہ نے اپنا علم کلام بنایا، اور ماتریدی خیال والوں نے اپنا نظام فکر مرتب کیا۔ بےشک ان سب کا اساس کتاب وسنت تھا، اور سب نے "محکمات" ہی پر اپنے علم وفکر کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی، لیکن ہر صاحب نظر کو اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق ہی دین کے اسرار اور حقائق معلوم کرنے کی توفیق نصیب ہوئی۔

شاید بے محل نہ ہو، اگر ہم شاہ ولی اللہ صاحب کی سب سے مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" کے ابتدائی مقدمہ کی ایک عبارت کا ایک مختصر سا خلاصہ یہاں پیش کر دیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے مسئلہ زیر بحث کی زیادہ وضاحت ہو سکے گی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "علوم یقینی اور فنونِ دینی کا اصل الاصول علم حدیث ہے۔ یہی مشعلِ ہدایت ہے، اور اسی سے دین کی صحیح راہ ملتی ہے۔ لیکن علمار حدیث کے مختلف طبقے ہیں، اور انکے متعدد مراتب ہیں۔ اس علم کے چھلکے ہیں، جن کے اندر بیج ہیں، اور اس کی سیپیاں ہیں، جن میں موتی ہیں۔ اس علم کو بڑے بڑے اہل فضل وکمال نے موضوع بحث بنایا۔ اس میں پہلا درجہ تو ان محدثین اور حفاظ کا ہے، جنہوں نے صحیح، اور ضعیف، متواتر اور غریب حدیث کی نظر سے اس علم پر بحث کی۔ یہ پہلا قدم ہے ظاہر سے اس علم کے باطن کی طرف جانے کا، اور چھلکے سے گودے تک پہنچنے کا۔ دوسرا درجہ احادیث کی لفظی اور معنوی تشریح اور توضیح کا ہے۔ اس موضوع کو عربی زبان وادب میں دستگاہ رکھنے والوں نے خاص کر لیا۔ اس کے بعد احادیث سے شرعی مسائل اور جزدی احکام استنباط کرنے کا درجہ ہے۔ اسی کو عام علمار نے لب لباب اور حاصل مقصد سمجھا، اور محقق فقہار اس کی بحث میں لگ گئے، لیکن میرے نزدیک احادیث کا بحیثیت مجموعی دقیق ترین علم، جو اپنے معانی میں سب سے عمیق، نورِ ہدایت میں سب

سے ارفع اور شرعی علوم میں سب سے افضل ہے، وہ اسرار دین کا علم ہے۔ جس کی مدد سے
احکام دین کی حکمت معلوم ہو، ان کی حقیقت کا پتہ چلے! اور دینی اعمال کے خواص اور
انکے نکات کو سمجھا جائے۔ خدا کی قسم یہ ہے وہ علم جس میں دوسرے سب علوم سے زیادہ
آدمی اپنے قیمتی وقت کو صرف کرے! اور اللہ تعالیٰ نے جن اطاعتوں کو ہم پر فرض کیا ہے، ان
کو ادا کرنے کے بعد اس علم کی تحصیل کو اپنی آخرت کے لئے زاد راہ بنائے" مولینا جب
اپنے طلبہ کو "حجۃ اللہ" کی یہ عبارت پڑھاتے تو اس علم کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے
اکثر یہ فرمایا کرتے کہ ایک زمانے میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ انکی سلطنت کا دبدبہ تھا۔
انکے بازوؤں میں قوت اور ان کے اخلاق میں پختگی تھی۔ انکی قومی جمعیت بنی ہوئی تھی۔ اور ان
کا قانون حاکم اور نافذ تھا۔ اس لئے اسرار دین کو سمجھنے اور ہر خاص و عام کو ان حکمتوں سے
واقف کرانے کی علماء نے اس وقت زیادہ ضرورت محسوس نہ کی۔ لیکن آج نقشہ ہی دوسرا ہے۔
نہ حکومت باقی رہی، نہ سلطنت کا دبدبہ ہے۔ جمعیت کبھی کی مفقود ہوگئی۔ قانون کا عمل دخل
نہیں رہا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں انتشار آخری حد تک پہنچ چکا ہے! اور تو اور اب
تو خود ہمارا دین اغیار کے نرغے میں ہے! اور اس پر ہر طرف سے، اور ہر طرح کے حملے ہو
رہے ہیں۔ اور ڈر یہ ہے کہ جس طرح ہماری قومی جمعیت توڑ دی گئی ہے۔ اسی طرح خدانہ
کرے کہیں ہمارے دین کو گزند نہ آجائے۔ چنانچہ آج اس زمانے میں تو اہل علم کا سب سے
اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ دین اسلام کی حکمتوں کو سمجھیں۔ اور غیر تو ایک طرف رہے، خود اپنوں
کو ان کے دین کی یہ حکمتیں سمجھائیں، کیونکہ اب تو نوبت اس کی آرہی ہے کہ کہیں مسلمان خود
ہی اسلام سے خدانخواستہ دل برداشتہ نہ ہو جائیں — اتنا کہنے کے بعد موصوف

قدرے توقف فرماتے اور پھر رک رک کر آہستہ سے کہتے کہ اس معاملہ میں میرا اپنا حال یہ ہے کہ شاہ صاحب کے اس ارشاد کے مطابق میں نے شروع زندگی سے فرائض کے بعد اسی شعبۂ علم کی تحصیل اور اسی کے مطالعہ کو اپنی تمام محنت و جستجو کا موضوع بنائے رکھا ہے۔ اور عمر بھر میری یہ کوشش رہی ہے کہ اسلام کے اصول و قواعد کے اسرار خود سمجھوں۔ اور ان حقائق سے دوسروں کو بھی آگاہ کروں۔

اسرار دین کی جستجو اور احکام اسلام کی حکمت کی تلاش۔ مولینا کا انقلابی فکر دراصل نتیجہ ہی انکے اسی دینی جذبے کی برسوں کی سخت اور پیہم جدوجہد کا۔ لیکن کہنے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے بھی اسرار دین کی جستجو کی ہے۔ پر ہمارا منتہائے نظر تو وہ نہیں، جس پر مولینا اپنی بحث و تحقیق میں پہنچے۔ سو بات یہ ہے کہ صاحب! آپ لوگوں کی تو کیفیت یہ ہے کہ خیر سے آپ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو ارد گرد سب کو ایک طرح زندگی گزارتے اور ایک طرح سوچتے دیکھا۔ بڑے ہوئے تو دیکھا دیکھی باپ دادوں کی روش پر چلنے لگے۔ آبائی علم پڑھا۔ بڑے بوڑھوں کی عادتیں سیکھیں۔ خاندانی حالات سازگار ہوئے تو ساری زندگی ایک ہی ڈھرے پر گزار دی۔ اور کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ اپنے خیالات اور عقائد و اعمال پر جرح کریں۔ اتفاق سے اگر کسی میں علم اور مطالعہ نے مذہبی جستجو کا شوق پیدا کیا تو اس نے اپنے خاندانی عقائد و اعمال میں کرید شروع کر دی۔ اس کے بعد اکثر تو ایسا ہوا کہ آپ بحث و تحقیق میں تھوڑی دور تیکھے جا کر کسی عالم اور بزرگ کی تاریخی عظمت سے مطمئن ہو گئے! اور آپ کو اپنے افکار و خیالات میں اپنے خاندان سے باہر جانے کی زحمت نہ اٹھانی پڑی۔ لیکن اگر حوصلہ بلند ہوا اور ذہن کی کاوش نے زیادہ

بے چین کیا تو فقہی تقلید کی جکڑ بندیوں سے نکل کر اہل حدیث میں جا ملے۔ یا او رہمت کی تو فقہ اور حدیث دونوں سے دامن چھڑا لیا اور قرآن کو اپنا مدار مان کر دل کو تسکین دے لی۔ بیشک آپ حضرات کے علم اور مطالعہ کی ہمارے دلوں میں کچھ کم قدر نہیں۔ لیکن معاف فرمایا جائے اگر ہم یہ عرض کریں کہ آپ کی اس قبیل کی تحقیق اور تدقیق اکثر تقلیدی ہوتی ہے۔ آپ کو آبا و اجداد سے جو نظر ورثہ میں ملی تھی، آپ نے اسی نظر سے اپنے گرد و پیش کی دنیا کو دیکھا۔ اسی نظر سے اپنی تاریخ کا مطالعہ کیا اور اپنے علوم و فنون کو بھی آپ نے اسی نظر سے پڑھا۔ غرضیکہ آپ کی یہ ساری تگ و دو اور کاوش و جستجو اپنی محدود دنیا میں محصور رہی۔ یہ صحیح ہے کہ اس محدود نظر کے ساتھ اسلام اور تاریخ اسلام کے مطالعہ سے جو نتائج برآمد ہوں گے، ان کی حیثیت بالکل جدا ہوگی، اس شخص کی بحث و تحقیق کے نتائج سے، جس کے ذہن میں سب سے پہلے اسلام کا تصور آیا ہو تو اس شکل میں کہ اگر اسلام کے پیش کردہ "اللہ" کو مانتے ہو تو سب سے پہلے "الٰہ" کا انکار کر دو۔ چنانچہ جب اس نے اسلام کا کلمۂ شہادت پڑھا ہو تو وہ واقعۃً "الٰہ" کا انکار کر چکا ہو۔ ادھر اس کے بعد اپنی تمام زندگی میں "الا اللہ" کی راہ میں جہاں بھی اس نے کسی "الٰہ" کو حائل پایا تو وہ "الٰہ" کو ترک کرنے کے بعد "الا اللہ" کی طرف بڑھا۔ ظاہر ہے "لا الٰہ الا اللہ" کے یہ معنی جو مولینا سمجھے تھے، ان لوگوں کے تصور توحید سے کتنے مختلف ہوں گے۔ جنھیں اپنی زندگی میں کبھی کسی "الٰہ" کو ترک کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کلمۂ توحید کے بارے میں مولینا فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک تو اقرار باللہ سے پہلے غیر اللہ کا انکار لازمی ہے۔ اور اسی

غیر اللہ کے انکار کی عملی جد وجہد کو میں جہاد کہتا ہوں چنانچہ مولینا مسلمان ہوئے تو اسلام کا یہ مفہوم سمجھ کر مسلمان ہوئے کہ وہ عقیدہ میں توحید خالص اور عمل میں جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ توحید اور اس طرح کا جہاد، مولینا کے نزدیک یہ دو اساس تھے اسلام کی تعلیمات کے! اور اسی اسلام کی کشش تھی جس نے آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے اُن سے گھر بار چھڑایا تھا اور اسی اسلام کو خارج میں متمکن اور حاکم بنانے میں انہوں نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔ ورنہ خدا نخواستہ اگر معاملہ دوسرا ہوتا اور بعض علمائے کرام جس قسم کے اسلام کو آج سرمایۂ افتخار بنائے ہوئے ہیں، مولینا کو بھی اسی اسلام کی دعوت ملتی تو شاید وہ بھی بغداد کے اس یہودی کی طرح جس کو حضرت جنیدؒ کے زمانے میں اسی قسم کے دعوت دینے والوں نے مسلمان ہونے کو کہا تھا، یہی جواب دیتے کہ معاف فرمائیے آپ حضرات کی توہین "غیر مسلم" ہی اچھا ہوں۔

مولینا کے ان معترضین کو معلوم ہونا چاہیئے کہ حسن اتفاق یا سوء اتفاق سے مولینا کے حالات کچھ ایسے تھے کہ موصوف نے آپ حضرات کی طرح کتاب وسُنت کو اپنے مخصوص خاندانی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا۔ اور پھر وہ آپ لوگوں کی طرح بزرگوں کی تقلید میں مسلمان نہیں ہوئے، بلکہ انھوں نے خود تحقیق کی، اور جب اسلام کو اپنے آبائی دین سے بہتر پایا تو مسلمان ہوئے۔ اس کے بعد واقعات ایسے پیش آئے کہ ان کا مطالعہ آپ کی طرح صرف اپنی تاریخ اور خاص اپنے علوم تک محدود نہ رہا۔ اور مزید اتفاق یہ ہوا کہ ان کو زندگی میں ایسے حالات سے سابقہ پڑا جن کی وجہ سے انھیں کئی ملکوں

کئی قوموں اور کئی مذاہب کی تاریخ اور ان کے ماضی و حال کے نشیب و فراز کو بامعان نظر دیکھنا پڑا۔ جب صورت یہ ہو کہ دماغ میں توحید کا عقیدہ اور دل میں جہاد کا جذبہ ہو اور نظر و فکر میں آفاق بینی اور آفاق گیری کے تجربات سمائے ہوئے ہوں۔ اور پھر اپنی پوری زندگی سرتاپا عمل، بے لوث اور بے ریا، مال و دولت سے بے نیاز۔ اور ہر رشتہ و پیوند سے آزاد رہی ہو تو جو شخص ان باطنی کیفیات کے ساتھ کتاب و سنت اور ولی اللہی علوم و معارف میں غوطہ زن ہوگا تو ظاہر ہے وہ ان میں جو کچھ پائے گا، اس سے ان اہل علم کی تحقیقات کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے جنہوں نے اسلام کو آبا پرستی کے ضمن میں اپنایا، اور جب اس کی خدمت کرنے نکلے تو اپنے دل و دماغ کو جاہ و منصب کی ہوس سے آزاد نہ کر سکے۔ توحید کا دم بھرا، لیکن امرا اور نوابوں کی شان میں قصیدے لکھے۔ جہاد کا نام لیا، لیکن تلوار تو ایک طرف رہی کبھی اپنی زبان یا قلم کو بھی راہ حق میں حرکت دینے کی جرأت نہ ہوئی۔ شہرت عامہ ان کے مقصود نظر رہی اور "قرب سلطانی" کو انہوں نے منتہائے کمال بنائے رکھا۔ اہل علم کا یہ طبقہ اگر مولینا پر خفا ہے، اور ان کے افکار و تعلیمات کو اسلام کے خلاف قرار دیتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کو اسلام واقعی اسی شکل میں نظر آتا ہو، لیکن انصاف شرط ہے کہ اس معاملہ میں مولینا کا کیا قصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولینا کتاب و سنت کے نام سے جو کچھ کہتے ہیں، ان کے دل اور دماغ پر کتاب و سنت کے مطالعہ سے واقعۃً یہی کیفیات گزری ہیں۔ اور شاہ ولی اللہ کی انقلابی حکمت کا جب وہ نام لیتے ہیں تو سچ یہ ہے کہ انہوں نے اس حکمت کو اسی طرح سمجھا ہے۔ اب یہ فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ ہمارے لئے ان بزرگوں کے فہم و بصیرت کا حاصل قابل قبول ہونا چاہیئے یا مولینا عبید اللہ صاحب سندھی

کے فکر و نظر کے نتائج۔

مولینا کے نزدیک توحید کا عقیدہ زندگی کی ایک زندہ اور فعال قوت تھی۔ اور ہمارے ان علماء نے اسی علم کلام کا ایک مسئلہ بنا دیا ہے۔ مولینا نے توحید کو مانا تو غیر اللہ کے خلاف معرکہ آرا ہونا ضروری سمجھا۔ اور یہ حضرات توحید کا سبق برسوں پڑھاتے ہیں لیکن کبھی اپنے اندر جذبہ کردار کو متحرک محسوس نہیں کرتے۔ مولینا کی نظر میں توحید فکر و عمل کے لئے انقلاب کا حکم رکھتی تھی۔ اور یہ لوگ توحید کے عقیدہ کے ساتھ جمود اور بے عملی کو بیک وقت جمع کر لیتے ہیں۔ اسی بنا پر مولینا اسلام کی ساری تاریخ میں عقیدہ توحید کا بہترین عملی مظہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور انکے صحابہ کے مبارک زمانے کو سمجھتے ہیں، جس میں عمار یاسرؓ اور بلالؓ جیسے غلام مصعبؓ و سعدؓ و سعیدؓ جیسے نوجوان اور ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ جیسے حسب نسب والے حضرت رسالت مآب علیہ الصلوۃ والسلام سے توحید کا سبق پڑھ کر اپنے سرکش اور ظالم آقاؤں کو چیلنج، اپنے مشفق و مہربان ماں باپ کو خیرباد کہتے اور اپنے عزیز و اقارب کو قتل کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ اسی عقیدۂ توحید کا اعجاز تھا کہ انہوں نے پرانے فرسودہ نظام کو ختم کر کے ایک نئی زندگی کی بنیاد رکھی۔ اور اپنے فکر و عمل سے دنیا میں ایک انقلاب کر دیا۔ مولینا قرآن مجید کی آیات جہاد کو بدر و احد و خندق کے معرکوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے پڑھتے ہیں۔ آپ کے مکی و مدنی دور کو سامنے رکھ کر قرآن کے احکام و قواعد کو سمجھنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ اور اس مبارک عہد کا نقشہ اپنے دل و دماغ میں تازہ کر کے کتاب و سنت سے ہدایت طلب کرتے ہیں جب مسلمانوں کی زندگی سراپا انقلاب تھی۔ "جاء الحق و زہق الباطل" کا نعرہ انکی زبانوں پر تھا اور انکے ہاتھوں سے قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں پاش پاش ہوئی

تھیں. یہ انقلابی زمانہ صحابہ کی یہ انقلابی سیرتیں اور ان کا یہ انقلابی کردار، مولینا کے نزدیک قرآن کی دعوت کا یہ ایک نمونہ تھا جو اسلام کے قرنِ اوّل میں متشکل ہوا! در ہر زمانے میں اسی انقلاب کو بار بار بروئے کار لانا قرآن کے ماننے والوں کا فرض ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے، کہ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور کے مطالعہ نے ہندوستانی مسلمانوں کی اس دور کی دو بڑی شخصیتوں پر ایک ہی اثر ڈالا! قبال مرحوم نے "جاوید نامہ" میں جمال الدین افغانی کی زبان سے ملتِ روسیہ کے نام جو پیغام دیا ہے، اُسے پڑھئے اور پھر مولینا کے ان افکار و خیالات کا مطالعہ کیجئے۔ یہ دونوں کے دونوں بزرگ اس بات میں متفق ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر انقلاب کا پیغام لیکر آیا تھا۔ اور "لا قیصر و لا کسریٰ" کو اس نے ابتدائی زمانے میں متحقق بھی کر دیا۔ ممکن ہے ہمارے علماء علامہ اقبال اور مولینا عبید اللہ سندھی دونو پر شواذ کا حکم لگائیں لیکن یاد رکھنا چاہئیے کہ ہماری قوم کے ان دو اہلِ بصیرت نے جو چیز بہت دور آتے دیکھی تھی، وہ اب بہت قریب آچکی ہے۔ خدا نہ کرے کہ ہم بے خبری کے عالم میں ہوں! اور وہ ہمیں آلے اس لئے اگر اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی مقصود ہے تو خدا کے لئے مولینا عبید اللہ سندھی اور علامہ اقبال کی صداؤں کو گوشِ ہوش سے سُنئے! در قرآن کی انقلابی دعوت کی راہ میں روک نہ بنئے۔

ہماری ان طول طویل معروضات کے بعد بھی اگر کوئی صاحب مولینا کے اسلام کو مجالِ بحث بنانے پر مصر ہوں! ور قرآن کی توحید اور اس کی دعوت جہاد سے جو کچھ موصوف سمجھے، اس کے تسلیم کرنے میں انھیں بدستور تامل ہو، تو ہم انکی خدمت میں بدرجہ مجبوری علامہ اقبال کے یہ شعر پیش کر کے انھیں قائل نہ کر سکنے کا اعتراف کرتے ہیں:۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے | ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے
وہ رمزِ شوق جو پوشیدہ لا الٰہ میں ہے | طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے
سُرورِ جو حق و باطل کی کارزار میں ہے | تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے
جہاں میں بندۂ حُر کے مشاہدات ہیں کیا | تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے

انقلاب کے ان بلند عزائم کے ساتھ مولینا واپس وطن لوٹے۔ جہاں تک انقلاب کے فکر کے نظری پہلوؤں کا تعلق تھا۔ یقیناً مولینا اس ضمن میں قطعی نتائج پر پہنچ چکے تھے۔ لیکن اب سوال درپیش تھا انقلاب کو بروئے کار لانے کا۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی سیاسی فکر کو ایک ملک میں عملی شکل دینے کے ضرورت پڑتی ہے، اس ملک کے خاص حالات اور اس کے ماحول کے مخصوص تقاضوں کے مطابق اس سیاسی فکر کے عملی مراحل کو درجہ بدرجہ طے کرنے کی۔ "ایک جست میں تمام قصہ طے کر دینا" فکر میں تو البتہ ممکن ہے لیکن عمل کی دنیا میں ایسا شاذ و نادر ہی دیکھا گیا ہے۔ اور اگر بفرضِ محال ایسا اگر ہو بھی جائے تو اس کا ردِ عمل خطرہ سے خالی نہیں ہوتا۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ انقلاب کا جذبہ ایک فوری اور پوری قوت کے ساتھ اقدام چاہتا ہے! اور خود انقلابی کی طبیعت بھی بڑی بے چین اور مضطرب ہوتی ہے۔ پر بات یہ ہے کہ ایک انقلابی انتظار بھی کر سکتا ہے۔ اور وہ اپنی طبیعت پر اتنا قابو ضرور رکھتا ہے کہ وہ ایک انارکسٹ کی طرح اپنے فکر و عمل کی انقلابی قوتوں کو بے راہ رو نہ ہونے دے۔ مولینا انقلابی تھے! اور صحیح معنوں میں ایک سچے انقلابی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انقلاب ایک فرسودہ نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ ایک بہتر اور زیادہ مفید نظام کو برسرِ کار

لانے کا نام ہے۔ اور ظاہر ہے پرانے نظام کی تخریب اگر آسان بھی ہو لیکن نئے نظام کی تعمیر اور اس نظام کو چلانے والوں کی تربیت میں ایک عرصہ لگتا ہے۔ مولینا ۱۹۳۹ء میں جب وطن لوٹے ہیں تو وہ کافی بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کے قویٰ میں بھی اضمحلال آ چکا تھا اور ان کو اس بات کا بھی پورا احساس تھا کہ ان کے چل چلاؤ کا زمانہ اب زیادہ دور نہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کے ضبط و نظم کی یہ حالت تھی کہ اس عمر میں اور اس قدر مایوسیوں اور ناکامیوں میں گھرے ہوئے انہوں نے گھبراہٹ اور جلد بازی میں یہ نہیں کیا کہ ان کے پیش نظر انقلاب کو عملی جامہ پہننے کے لئے جن تمہیدی کاموں اور ابتدائی تیاریوں کی ضرورت تھی، وہ ان سے اپنی طبیعت کے انقلابی جوش میں آنکھیں بند کر لیتے۔ مولینا اس عالم میں بھی اس طویل راہ کو نہیں بھولے۔ جس پر چلے بغیر ہندوستان کے لئے اس زمانے میں اور موجودہ حالات میں کسی انقلاب کا سوچنا ایک حد تک محال ہے۔ ہاں اس معاملہ میں مولینا یہ ضرور چاہتے تھے کہ اس طویل راہ کو انقلابی ذہنیت اور انقلابی عمل کے ساتھ جتنی جلد ہو سکے، قطع کرنے کی کوشش کی جائے۔

آجکل ہندوستان کی حالت یہ ہے کہ اس پر برطانیہ جیسی زبردست یورپی طاقت کا قبضہ ہے۔ جو ملک کے تمام سیاسی اور معاشی وسائل پر پوری طرح مسلط ہے۔ لڑنے والی فوجیں گو ہندوستانی ہیں، لیکن ان کے افسر سارے کے سارے انگریز ہیں۔ دفتری حکومت بہت حد تک ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے لیکن حقیقی اقتدار در اصل اعلیٰ عہدہ داروں ہی کے پاس ہے۔ جو زیادہ تر برطانی ہیں۔ بیشک اہل ہند کے بیدار طبقوں کی طرف سے اجنبی تسلط کے خلاف ایک عرصہ سے بڑے زوروں پر کوشش ہو رہی ہے اور اس کا اتنا اثر

بھی ہوا ہے کہ برطانی حکومت کی آہنی گرفت کچھ ڈھیلی پڑگئی ہے! اور برطانیہ والے مجبوراً ہندوستان کے ساتھ باعزت سمجھوتہ کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ماننا پڑیگا کہ جہاں تک ہندوستانی جمہور اور یہاں کی ہندوستانی فوج کا تعلق ہے ابھی وہ اس قابل نہیں کہ ان کے بل پر کسی جمہوری انقلاب کا خیال بھی کیا جاسکے۔ مولینا اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ آج اس وقت اور ان حالات میں فوری انقلاب کی باتیں کرنا محض پریشان خیالی اور تضیع وقت ہے۔ جب تک ہم اپنے عوام کو منظم نہ کرلیں، اور ہماری فوج اس قابل نہ ہو جائے کہ وہ ضرورت کے وقت اس ملک کی حفاظت کرسکے، مولینا کی رائے میں کوئی جمہوری انقلاب یہاں ممکن نہیں ہے۔ اور اگر کسی صورت میں اس کا امکان نکل بھی آئے تو قبل از وقت انقلاب کے نتائج ہمارے حق میں اچھے نہیں ہونگے۔ اس لئے آج وقت کی سب سے اہم ضرورت اور وطن کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ہم اپنی پوری انقلابی قوتوں کو عوام کے منظم کرنے میں لگادیں! ور جس طرح بھی ممکن ہو اپنے ملک کو اس قابل بنائیں کہ آگے چل کر اس کی فوج خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے۔

ہندوستانی عوام کیسے منظم ہوں؟ اور ہندوستان کی فوجی طاقت کس طرح آج کی ضرورتوں کے مطابق مضبوط کی جاسکتی ہے؟ مولینا نے اپنے خطبات اور مقالات میں بار بار اسی مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا مسئلہ جسکو حل کئے بغیر مستقبل کی کوئی تدبیر عمل میں نہیں آسکتی، ہندوستان پر اجنبی تسلط کا مسئلہ ہے۔ گزشتہ ایک سو برس سے اس ضمن میں جو بھی کوششیں ہوئی ہیں، ان سے کبھی بھی خاطر خواہ نتائج نہیں نکل سکے۔ اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف طبقوں نے

اب تک یک خیال اور یک سو ہو کر کبھی اس ملک کو آزاد کرانے کی جد وجہد نہیں کی۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی فوج اور بعض جاگیر داری طبقے اٹھے۔ لیکن عوام اور متوسط طبقے ان کے ساتھ نہیں تھے۔ اس لئے نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس کے بعد وہ لوگ جو انگریزی علوم پڑھ کر آزادی کی قدر وقیمت سمجھنے لگے تھے۔ انہوں نے برطانیہ سے ملک کی حکومت میں اپنا حصّہ مانگنا شروع کیا۔ یہ تحریک ۱۸۸۵ء سے کانگریس کے قیام کی شکل میں شروع ہوئی ہے۔ ابتدا میں تو محض اونچے انگریزی پڑھے لکھے لوگوں تک یہ تحریک محدود رہی لیکن آہستہ آہستہ اس کا دائرہ اثر بڑھتا گیا! اور بعد میں جب ملک کے متوسط طبقوں کو اس میں بار ملا تو ۱۹۲۰ء سے مسلمان بھی بہت بڑی تعداد میں اس میں شامل ہوگئے۔ اجنبی تسلط کو اس ملک سے بے دخل کرنے کیلئے ہندوستانیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی کسی ایک نظام میں متحد و یکجا ہو کر اگر کبھی برطانیہ کے خلاف صف آرا ہوئی ہے تو وہ کانگریس ہی کا نظام تھا! در حقیقت ان معنوں میں تو صرف کانگریس ہی ایک ایسی جماعت ہو سکتی ہے۔ جو برطانیہ سے ہندوستان کو آزاد کرا سکے۔ لیکن یہ ملک کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ اسوقت ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ ہم گذشتہ دس برسوں سے دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان بتدریج کانگریس سے دور ہٹتے چلے جا رہے ہیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا آپس کا اختلاف اجنبی غلامی کی زنجیروں کو اور مستحکم کر رہا ہے۔ ہر نیا دن ہمارے لئے تازہ مصیبت لاتا ہے! اور ہماری آپس کی دشمنیاں بجائے کم ہونے کے بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ کی گرفت روز بروز اور مضبوط ہو رہی ہیں! ان حالات میں ظاہر ہے کہ عوام کی تنظیم خاک ہوگی! اور جمہوری انقلاب کا خیال کس طرح قابل عمل ہو سکیگا۔ مولینا کا خیال یہ ہے کہ اگر اس ملک سے اجنبی تسلط کو ختم کرنا ہے۔ یہاں کے عوام

میں سیاسی شعور پیدا کرنا ہے۔ اور اس طرح خدا کی اتنی بڑی مخلوق کے لئے جو اس ملک میں انگنت روگوں اور نا قابل بیان مصیبتوں میں جان توڑ رہی ہے، آزادی خوش حالی اور عزت و آبرو کی نعمتوں کو عام کرنا ہے تو خدا کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ان آپس کے تفرقوں کو دور کرنے کی کوئی تدبیر سوچئے۔ اور ان کی موجودہ غلط فہمیوں کا کوئی حل ڈھونڈھئے تاکہ یہ سب ملکر اس ملک سے برطانی قبضے کی لعنت کو دور کر سکیں۔ مولینا جب کانگرس کا نام لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں کانگرسی ہوں اور کانگرس میری ہے، اور میں کانگرس کا چار آنے والا ممبر نہ ہوتے ہوئے بھی کانگرس میں ہوں، تو ان کا مطلب در اصل کانگرس کے اس سیاسی تصور سے ہے جس کے تحت وہ تمام مذہب و ملت کے ہندوستانیوں کو ایک نظام میں متحد ہو کر اجنبی تسلط کے خلاف جد و جہد کرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ مولینا کانگرس کی موجودہ قیادت سے کتنے بدظن تھے اور گاندھی جی کے فلسفہ سے انھیں کس قدر بعد تھا لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اگر اس ملک سے برطانیہ کی حکومت کو بے دخل کر کے یہاں ہندوستانیوں کے کسی سیاسی نظام کو اُس کی جگہ لینا ہے تو وہ کانگرس کے اس تصور کے علاوہ اور کونسا سیاسی نظام ہو سکتا ہے۔ مولینا نے اپنے خطبوں میں بار بار کہا ہے کہ برطانیہ سے ہندوستان کی حکومت کا چارج صرف کانگرس ہی لے سکتی ہے۔ اور یہ ہے بھی سچ۔ لیکن یہ کانگرس گاندھی جی اور سردار پٹیل کی موجودہ کانگرس نہیں ہوگی۔ اس کانگرس میں تو ہندوستان کی سب قوموں کی ایک سی آواز ہوگی اور یہ سب کی صحیح معنوں میں نمائندہ ہوگی۔ کم سے کم موجودہ حالات میں اگر اتنا ہو جائے کہ گاندھی جی کی کانگرس اور مسٹر جناح کی مسلم لیگ آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیں تو مولینا کے نزدیک اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ موصوف کے ذہن میں کل ہند

کانگریس کا جو تصور ہے، اس سمجھوتے سے اس کی طرح پڑ سکے گی! دوسرے اس سمجھوتے کی وجہ سے جہاں تک ہندستان کے اندرونی معاملات کا تعلق ہے، ہم برطانیہ کے اقتدار کو بہت حد تک بے اثر کرنیکے قابل ہو جائیں گے۔ مولٰنا اس مرحلہ کو "ڈومینین اسٹیٹس" کا نام دیتے ہیں۔ اور ان کا کہنا یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مستقبل کے جمہوری انقلاب کی پہلی منزل ہندو مسلم اتحاد، یا فی الحال اسے کانگریس لیگ سمجھوتہ کہہ لیجئے، کی ہے۔ اس سے یہ ہوگا کہ ہم برٹش کامن ویلتھ میں رہتے ہوئے پوری آزادی سے اپنے عوام کی معاشی، تعلیمی، اجتماعی اور اخلاقی حالت کو درست کر سکیں گے اور یہ عوام کی صحیح تنظیم کی طرف ہماری جد وجہد کا پہلا قدم ہوگا۔ بیشک اسمیں ہمیں ایک مدت لگے گی۔ لیکن اگر اس اصلاح کی زمام کار انقلابیوں کے ہاتھ میں ہوئی تو خدا نے کیا ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

کانگریس لیگ کا سمجھوتہ بیشک آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ لیکن اس طرح کے سمجھوتے دونوں میں کئی بار ہوئے اور پھر ٹوٹ گئے۔ ہندو مسلمان پہلے بھی کئی بار ملے لیکن پھر آپس میں جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ مولٰنا کے خود اپنے الفاظ میں "ہندوستان کا سیاسی تقدم اتنا مشکل نہیں جتنا پہلے سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ امر بھی ساتھ ہی منکشف ہو جاتا ہے کہ یہ کھیل جب کبھی بھی بن کر بگڑتا ہے تو اس کی تہہ میں ہندو مسلم اختلاف ہی نظر آتا ہے۔" مولٰنا کے پیش نظر جیسا کہ ہم پہلے بتا آئے ہیں، دراصل جمہور عوام کا انقلاب ہے! اور اس عمومی انقلاب کے لئے ان کے نزدیک شرط اول یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کی آپس کی تاریخی عداوت، انکے فکری تنافر اور باہمی قومی اور جماعتی مخالفت کا ہمیشہ کیلئے قلع قمع ہو جائے۔ اور نیز مسلمانوں کو اس غلطی سے بھی نکالنے کی ضرورت ہے کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے ہندوستانی نہیں بن سکتے۔ بدقسمتی سے ہندوستانی مسلمانوں کی غالب تعداد غلطی سے ابتک یہ سمجھ رہی ہے کہ اسلام وطنیت کے

منافی ہے! ور ایک سچا مسلمان قوم و وطن کی ملکی حدود سے آزاد اور بے تعلق ہوتا ہے۔ اگر مسلمان عوام میں اپنے موجودہ گرے ہوئے اور بوسیدہ ماحول کی تخریب اور اس کی جگہ نئی زندگی کی تعمیر کا احساس اور اسکے لئے حوصلہ و عزم پیدا کرنا ہے، تو ضروری ہے کہ سب سے پہلے انکی اس غلط فہمی کو رفع کیا جائے اب تک بارہا ایسا ہو چکا ہے کہ مسلمان عوام کے جوش عمل کو اس ملک سے دور کسی دوسرے اسلامی ملک کی خاطر حرکت میں لایا گیا! ور چونکہ دوسرے اسلامی ممالک کے حالات ہمارے اختیار سے باہر تھے اس لئے کسی وجہ سے جب انہوں نے اپنا طریقہ کار بدل دیا۔ تو ہم کہیں کے نہ رہے! ور ہمارے عوام بھی مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ بیشک مسلمان عوام میں انقلاب کی غیر معمولی صلاحیتیں موجود ہیں۔ لیکن انھیں دور کے سہانے خواب دکھا کر اصل مسئلہ سے غافل کر دیا گیا ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان عوام اپنے دین کی صحیح انقلابی حیثیت کو سمجھیں! ور اپنی انقلابی قوتوں کو، جنکی ان کے ہاں کمی نہیں ہے خود اپنے وطن کو بہتر بنانے میں پورے یقین و ایمان کے ساتھ صرف کر دیں۔ اس سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے اہل وطن بھی یہ سمجھ لیں کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا نہیں ہے۔ اسکو بنانے، ترقی دینے، اور اس منزل پر لانے میں مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس لحاظ سے اگر مسلمان ہندوؤں سے زیادہ نہیں تو اُن سے کسی حیثیت سے اس ملک کے کم مالک نہیں ہیں۔

اصل دین کیا ہے؟ اسلام کی دنیا کے تمام دینوں میں کیا حیثیت ہے؟ خدا کو ایک ماننے کے کیا معنی ہیں؟ یہ کائنات جس کا ہم ایک حصہ ہیں، کیسے وجود میں آئی! ور انسان کا اس کائنات میں کیا مرتبہ ہے؟ انسانوں کا مختلف دینوں اور ملکوں میں تقسیم ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور کیا یہ ضروری ہے کہ انسان مختلف ملتوں میں بٹ کر اور جدا جدا ملکوں میں بس کر ہمیشہ آپس میں برسر پیکار ہی رہے۔ یا اس کا کوئی امکان ہے کہ کوئی ایسا مذہبی فکر اور کوئی ایسا سیاسی نظام سوچا جا سکے۔ جو خدا کی

ساری مخلوق کو مہر و محبت کے رشتے میں پرو کر انھیں زندگی کے ایک اعلیٰ اور بلند مقصد کے حصول کیلئے سرگرم عمل کر دے؟ مولینا نے اپنے دینی فلسفے اور سیاسی نصب العین کے ضمن میں انھیں سوالوں کے حل کرنیکی کوشش کی ہے! ان تفصیلات کو بیان کرنیکی نہ تو یہاں گنجائش ہے! ورنہ اس کا یہ موقع ہے۔ جن لوگوں کو ان مسائل کے متعلق مولینا کی تفصیلی آراء معلوم کرنا ہوں، وہ انکی دوسری کتابوں کا مطالعہ کریں! ان مسائل میں مولینا کے افکار و خیالات کا لب لباب یہ ہے کہ اسلام دراصل مذاہب عالم کی تاریخ کی آخری کڑی ہے۔ جس نے تمام ادیان کے بنیادی اصولوں کو ایک کتاب میں منضبط کر دیا۔ مولینا کے نزدیک ہر مذہب اپنے زمانے کیلئے ایک انقلاب کا پیغام لایا! اور اس مذہب کے نبی کی ذات گرامی اس انقلاب کی حامل تھی! اسلام بھی دنیا میں ایک انقلاب کا پیغام لیکر آیا لیکن جس طرح اسلام پہلے کے تمام ادیان کا نقطۂ کمال ہے! اور اسلام کی کتاب تمام الہامی کتابوں کی مصدق اور انکی بنیادی تعلیمات پر جامع ہے! اسی طرح اسلام کا انقلاب بھی تمام انسانیت کے لئے عام ہے! اور وہ اپنے مقصد میں عالمگیر اور بین الاقوامی ہے۔ اسلام کو بین الاقوامی انقلاب کا نقیب ماننے کا عملاً نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک قوم اسلام کے انقلابی اصولوں پر اپنے قومی وجود کی تشکیل کر سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی قومی جمعیت اگر اسلام کے اصولوں کی حامل ہو تو وہ اسلام کی عالمگیریت کی ضد نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کی یہ عالمگیریت دراصل مجموعہ ہے مختلف اسلامی قومی جمعیتوں کا جو اپنی اپنی جگہ مستقل حیثیتوں کی مالک ہونگی۔ بیشک اسلام تو وطن اور ملک کی حدود سے بالاتر ہے لیکن ایک قوم اپنے قومی وجود کو برقرار رکھتی ہوئی اسلام کو اپنا سکتی ہے۔ انہی معنوں میں مولینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بھی دو حیثیتیں مانتے ہیں۔ ایک قومی، جسکے ذریعہ عرب بحیثیت ایک قوم کے اسلام کے انقلاب کے حامل بنے! اور اس سے انکی قومی جمعیت کو استحکام اور سربلندی

نصیب ہوئی! اور دوسری اس بعثت کی ہمہ گیر اور عالمگیر حیثیت، جس کے فیض سے اسلام کا یہ انقلاب عربوں تک محدود نہ رہا۔ بلکہ عربوں کے بعد دوسری قوموں نے بھی اس سے نئی زندگی پائی۔ اور آئندہ بھی رہتی دنیا تک اسلام کی اس انقلابی دعوت کا اثر و فیض برابر جاری رہے گا۔

اس بیان سے مولینا کا حاصل مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستانی بن کر یہاں اس ملک میں اسلام کے اصولوں پر انقلاب کرے! اور وہ اپنے ہندوستانی ہونے کو اسلام کی کسی غلط تعبیر کی وجہ سے اسلام کے خلاف نہ سمجھے، بلکہ اس کے برعکس اپنی ہندوستانی قومیت کو اسلام کی صحیح بین الاقوامی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی تعلیمات کے عین مطابق جانے لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ ہندوستانی قومیت اسلام کی بین الاقوامی روح انقلاب سے متضاد نہ ہو۔ غرضیکہ ہندوستانی مسلمان دنیا کی اسلامی برادری کا ایک مستقل رکن ہے۔ اس کا اپنا وطن ہے! اپنا کلچر ہے اپنی تاریخ ہے! اور اپنی زبان اور اپنا ادب ہے۔ ہندوستانی مسلمان کو اگر اس دنیا میں عزت و اقبال حاصل کرنا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنے قومی وجود اور اپنی قومی خصائص کو ترقی دے! اور اپنی ہندوستانی قومیت کو اسلام کے بین الاقوامی انقلاب کے رنگ میں رنگ کر اسے خود اپنے لئے! اپنے غیر مسلم اہل وطن کیلئے اور دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے لئے خیر و برکت کا باعث بنائے۔ یہ ہیں وہ اغراض و مقاصد جنکے لئے مولینا اپنے خطبوں میں بار بار ہندوستانی مسلمانوں کو نیشنلسٹ بننے کی دعوت دیتے ہیں۔

ہندوستان محض ہندوؤں کا وطن نہیں، جیسا کہ غلطی سے بعض ہندو سمجھتے ہیں، یا جیسے بعض مسلمانوں نے اپنی بے سمجھی سے یہ کہہ کہہ کر ہندوؤں کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ واقعی مسلمان کا کوئی خاص وطن نہیں ہوتا۔ اسلئے ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے۔ مولینا نہایت شدت سے اس خیال کی تردید فرماتے ہیں۔ انکے نزدیک وطن خاک و آب و باد کا نام نہیں! ورنہ وطن کے معنی

جامد زمین کے ہیں وطن ایک نمو پذیر وجود ہے مثلاً ہندوستان ایک وطن ہے۔ جہاں کبھی گونڈ اور بھیل بستے تھے۔ شمال سے آریا آئے۔ اور انہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا۔ آریاؤں نے ہندوستان کو نئی تہذیب دی۔ اُسے صدیوں تک ترقی کی شاہراہ پر چلایا۔ یہاں فلسفے بنے۔ علوم کا رواج ہوا۔ کرشن جی اور مہاتما گوتم جیسے اصحاب مذاہب اور اشوکا جیسے فرمانروا ان آریاؤں ہی کی طفیل اس ملک کو نصیب ہوئے۔ جن کی بدولت آج ہندوستان کا نام دنیا میں عزت سے لیا جاتا ہے۔ ان آریاؤں کو زوال آیا تو شمال سے انکے دوسرے بھائی بند نیا مذہب، زندگی کا نیا فلسفہ نئے علوم و فنون اور نئی تہذیب و تمدن لیکر اس وطن میں وارد ہوئے۔ اور انہوں نے اس کی کایا پلٹ دی۔ مسلمانوں سے پہلے ہندوستان کی جو بُری حالت تھی اور جس قسم کا سیاسی انتشار، اخلاقی انحطاط، ذہنی جمود اور اجتماعی بدنظمی یہاں تھی، اس کا مقابلہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کے دور اقبال کیجئے۔ جب کہ کابل سے لیکر بنگال تک اور کشمیر سے دکن تک اس تمام براعظم میں امن و امان کا دور دورہ تھا، سب ایک حکومت کے تابع اور ایک قانون کے ماتحت آرام و آسائش سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے اس طویل عہد میں مسلمانوں نے محض بڑے بڑے فاتح اور حکمراں پیدا نہیں کئے، انہوں نے تاج محل اور لال قلعے جیسی عجائب روزگار عمارتیں نہیں بنائیں، اور ان کے صوفیا کرام نے اپنی پاک زندگیوں اور اپنے محبت بھرے بولوں سے یہاں کے باشندوں کو محض مسلمان نہیں کیا۔ بلکہ مسلمانوں کے فکر و عمل نے خود ہندوؤں کے دلوں اور دماغوں میں بیداری کی ایک لہر پیدا کر دی۔ اور انکے اثر سے ان میں کئی ایک اصلاحی تحریکیں اٹھیں۔ جنکی وجہ سے ہندو عوام جو صدیوں سے بےخبر سوئے پڑے تھے بیدار ہونے کے لئے کروٹیں بدلنے لگے۔ اسی زمانے میں ہندوستان کی مقامی زبانیں وجود میں آئیں۔ اور بڑے بڑے مصلح اور بھگت ان زبانوں میں عوام کی دبی ہوئی

خواہشات اور بجھی ہوئی امنگوں کو اپنے گیتوں میں بیان کرنے لگے۔ بیشک مسلمان حکمراں طبقوں کو اس تمام عرصہ میں زیادہ تر حکومت وسطوت سے تعلق رہا۔ اور یہ اُس زمانے کے خاص حالات کے پیش نظر ایک حد تک ضروری بھی تھا۔ لیکن اس سیاسی سطوت کے ساتھ ساتھ ہزارہا ہزار اصحاب علم وفکر اور بیشمار اہل رشد وہدایت بزرگ بھی موجود تھے، جنکا مقصد نہ مادی دولت ہوتا اور نہ کوئی سیاسی اقتدار۔ یہ لوگ حکومت کے خرخشوں سے دور علوم وفنون کے مطالعہ اور فلسفہ وحکمت کی تحقیق میں اپنی ساری ساری عمر گزار دیتے، ما ناکہ بادشاہوں کی ہیبت سے رعایا کانپا کرتی لیکن ان بزرگوں کے خلاف جاتے یہ بادشاہ بھی ڈرتے تھے۔ حکمراں طبقے اسلامی ہند کے جسم کے محافظ تھے لیکن ان بزرگوں نے اسلامی ہند کے ذہن اور اس کی روح کو جلا بخش کر اسے نکھارا۔ مسلمان اہل علم کی تحقیقی جدوجہد محض اسلامی علوم وفنون تک محدود نہ تھیں۔ ان میں کے بعض ہندوستان کی قدیم زبانیں سیکھتے۔ یہاں کے پرانے علوم کا کھوج لگاتے اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کا عربی اور فارسی میں ترجمہ کرتے، انہوں نے یہاں کے فلسفے اور یوگ کو بھی، جس پر صدیوں کے توہمات اور جہالت کی تہیں جمی ہوئی تھیں، کھنگالا۔ اُسے اپنی حکمت ودانش کی مدد سے نئی زندگی عطا کی۔

الغرض مسلمانوں نے اپنے ان سیاسی، علمی اور تحقیقی کارناموں سے اس طرح اپنے آپ کو اس وطن کا سب سے بہتر سپوت ثابت کر دیا۔ "اور یہ ورثے" انکے دم قدم سے تمام دنیا میں نیکنام ہوئی۔ اور "مغل اعظم" کا ذکر سات سمندر پار کے ملکوں میں بڑی عظمت واحترام سے کیا جانے لگا چنانچہ ہندوستانی مسلمان کو آج پورا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس وطن کا مالک سمجھے۔ مولینا کے الفاظ میں "صحیح معنوں میں ہندوستانی وہ ہے جس نے ہندوستان کا انتشار دور کر کے اس میں وحدت پیدا کر دی ہو۔ اور اُسے ایک راستے پر لگا دیا ہو ...... پس جب مسلمان کہتا ہے کہ

"ہندوستان ہمارا" تو اس میں ایک عظیم الشان حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج ہمارے پرانے اور نئے تعلیمیافتہ لوگ ان باتوں پر غور کرنے سے یکسر عاری ہو چکے ہیں! ور صرف اپنی مردم شماری کے دھندوں میں پھنس کر رہ گئے ہیں! ور ہندوستانی ہونیکی حیثیت سے انکے جو حقوق ہیں ان کے حصول کی کوشش نہیں کرتے۔"

یہ ہے مولینا کی ہندوستانیت اور یہ ہے انکی وطنیت۔ ان کو اپنی اس ہندوستانیت اور وطنیت پر اتنا فخر ہے جتنا اپنے اسلام پر۔ اب جو لوگ اسلام اور اس ہندوستانیت کے اجتماع کو بزعم خود اپنے اسلام کے منافی سمجھتے ہیں، تو ان کی خدمت میں صرف اتنا عرض ہے کہ خدا نے چاہا تو مولینا کا اسلام ہندوستانی بن کر اس سرزمین میں نہ صرف خود زندہ رہے گا، بلکہ اپنوں اور غیروں کو بھی زندگی اور قوت بخشے گا! ور آپ کا اسلام خلا میں رہنے کی وجہ سے یہاں محض بحث و مجادلہ کا موضوع بن کر رہ جائے گا۔

عالمگیر کے بعد ہندوستان پھر ادبار میں آگیا۔ چنانچہ سات سمندر پار سے ایک نئی قوم ہندوستان پر حملہ آور ہوتی ہے۔ یہ قوم بھی ایک نئے تمدن نئے طریقہ کی زندگی اور نئی عمرانی اور معاشی قوتوں کے ساتھ ہمارے ملک میں آتی ہے اور جیسے پہلوں نے اس سرزمین کو اپنے اپنے وقتوں میں بدلا تھا، اسی طرح یہ قوم بھی ہمارے وطن کو پرانے دور سے نکال کر ہمیں ایک نئی زندگی سے آشنا کرتی ہے لیکن پہلوں اور اس قوم میں یہ فرق ہے کہ پہلے تو باہر سے آئے اور یہاں کے ہوگئے لیکن اس قوم نے اب تک اپنے آپ کو ہم سے اجنبی ہی رکھا، اور بظاہر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ یہ قوم اس وطن کو اپنا سمجھنے لگے۔ اس لئے ہندوستان کے قومی وجود میں انکے لئے کوئی جگہ نہیں لیکن ہمارے علوم اور ہماری صنعت و معیشت اور سیاست و اجتماعیت میں یورپ کی اس قوم کے بدولت جو

انقلاب آیا ہے، مولینا اس کے فوائد کے بہت حد تک معترف ہیں، بلکہ جس عمومی انقلاب کا وہ فکر پیش کرتے ہیں، یہ انقلاب انکے خیال میں اس بڑے انقلاب کی ان گھڑسی ابتدائی شکل ہے۔ مولینا کا یہ عمومی انقلاب ہندوستان کے جمہور کا انقلاب ہوگا۔ اور ہمارے یہ جمہور مشین اور مشین کے استعمال سے جو اثرات پیدا ہوتے ہیں، ان کے ذریعہ بیدار اور منظم ہوں گے۔ ہمارا ملک چونکہ اس اجنبی حکومت کی وجہ سے ہی مشین سے متعارف ہوا ہے۔ اس لئے اس معاملہ میں مولینا کی رائے یہ ہے کہ ہمیں برطانیہ کا شکرگذار ہونا چاہیئے۔ یہ عمومی انقلاب محنت کش مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھ سے ہوگا۔ مولینا کے اپنے الفاظ میں "اگرچہ ہم آج انقلاب کی پہلی صف میں کھڑے نہیں ہوسکتے، مگر دوسرے یا تیسرے دن ہم پر سب کچھ عائد ہوسکتا ہے۔ جو یورپ کی جمہوریت پسند قوم پر آج وارد ہوگا"۔ الغرض موصوف آج کی دنیا میں مشین کو نئی زندگی کی مادی ضروریات کا سب سے بڑا اساس مانتے ہیں اُن کے نزدیک اگر ہم نے مشین کا استعمال نہ سیکھا تو ہم دنیا کی قوتوں میں اچھوت بن جائینگے۔ مشین کے بعد وہ جمہوریت کو نئی زندگی کا اساس بناتے ہیں اور اس معاملہ میں بھی وہ برطانیہ کا احسان مانتے ہیں کہ اس نے ہمیں جمہوری طریقوں سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔

ہندوستان گونڈوں اور بھیلوں کے زمانے میں جیسا کچھ تھا، تھا۔ آریا آئے تو انہوں نے اس کی جون بدلی اور انکی وجہ سے ہمارے وطن میں ایک انقلاب آیا۔ اس کے بعد مسلمان آئے۔ اُن سے ہمارے وطن کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اور انہوں نے اس ملک میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ مولینا کا کہنا یہ ہے کہ آریائی دور کبھی کا ختم ہوچکا۔ اسی طرح ہندوستان کا اسلامی دور بھی اپنی انقلابی قوتوں کو کھو چکا ہے۔ اب ہندوستان میں ایک نیا انقلاب ہوگا۔ یہ انقلاب ہندو اور مسلمان دونوں مل کر کریں گے۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے اوپر کے طبقے نہیں۔ یہ طبقے تو اپنی زندگی کے دن گزار

چکے۔ برطانی تسلط کا دراصل مطلب ہی یہی تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے حکمراں طبقے اب ہندوستان کی حکومت کے اہل نہیں رہے۔ بیشک ان میں بعض صالح عناصر اب تک موجود ہیں اور وہ کہا نئے انقلاب کی سب سے بڑی قوت بن سکتے ہیں۔ لیکن یہ انقلاب لازمی طور پر ہوگا عوام کے ذریعے۔ مولانا کی ساری کوشش یہ ہے کہ یہ عوام ہندوستانی عوام ہوں۔ ہندو عوام ہوں، مسلمان عوام ہوں! اور ہندوستان کے یہ ہندو اور مسلمان عوام مل کر اس عمومی انقلاب کو بروئے کار لائیں۔ انھیں ڈر یہ ہے کہ جس طرح پہلے بارہا ایسا ہوا ہے کہ ہندوستان والے زمانے کی رو سے بہت پیچھے رہ گئے، اور جب نئے حالات کی وجہ سے انھیں اپنی زندگی کو بدلنے کی ضرورت پڑی تو وہ اتنے بیکار ہو چکے تھے کہ ان کو مجبوراً باہر کی انقلابی قوتوں کے ہاتھ میں اپنے ملک کی عنان حکومت دینی پڑی کہیں پھر ایسا نہ ہو۔ مولانا کے لئے ہندوستان کے مستقبل کا یہ تصور بڑا تکلیف دہ ہے، اسی لئے جب وہ اوپر کے طبقوں کو مخاطب کرتے ہیں تو انکے لہجے میں انتہائی شدت ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ مولانا ہندوستانی جمہور کو اٹھانے کے لئے بڑے بیتاب ہیں۔ کیونکہ ان کے اُٹھنے میں جتنی بھی دیر لگے گی، ان کے نزدیک ہمارا مستقبل اور تاریک ہوتا جائے گا۔ لیکن جمہور کو اٹھانے کا یہ کام ہندوستان کے اوپر کے طبقوں کے جو صالح عناصر ہیں، ان کے کرنے کا ہے۔ اگر خدانخواستہ انہوں نے ادھر سے غفلت برتی۔ تو ہمارے ملک کا جو حشر ہوگا، اس کو زبان پر لاتے ڈر لگتا ہے۔ چنانچہ مولانا ملک کے ان صالح عناصر کے سامنے اپنا انقلابی فکر پیش کرتے ہیں۔ مولانا کا یہ فکر انقلابی ہے۔ انسانیت عامہ کے اصولوں پر مبنی ہے۔ ہندوستانی ہے، اور اسلامی ہے۔ اس لئے یہ صالح عناصر اگر چاہیں تو اس فکر کو بڑی آسانی سے اپنا سکتے ہیں! اور اس طرح یہ لوگ اپنے ملک کے عوام کے انقلاب کے جو آج نہیں تو کل آکر رہے گا، رہنما اور قائد بن جائینگے۔ ہمارے ہاں

کے مزدوروں اور کسانوں کے اس قسم کا انقلاب کا نتیجہ ایک ایسا ہندوستان ہوگا جس کی رفعت اور عظمت کی تاریخ میں شاید ہی کوئی مثال مل سکے۔

مستقبل کا یہ ہندوستان جس کے بنانے کے منصوبے بے کو مولینا وطن لوٹے، اس کا ایک عنصر تو مشین ہوگا! اور دوسرا عنصر جمہوریت لیکن اگر مشین اور جمہوریت کی برکات ایک طبقے تک محدود رہیں تو اس کا نتیجہ موجودہ سرمایہ داری ہی جس سے بڑھ کر آج کے زمانے میں کوئی لعنت تصور میں نہیں آسکتی۔ مولینا مشین اور جمہوریت کی برکات کو ہر خاص و عام میں مشترک کرنا چاہتے ہیں اسے آج کی اصطلاح میں سوشلزم کا نام دیدیجئے۔ مولینا چاہتے ہیں کہ اس نئے ہندوستان کا ظاہری ڈھانچہ تو بیشک مشین، جمہوریت اور سوشلزم کے عناصر سے ترکیب پائے لیکن اس کا معنوی وجود ان عناصر کی طرح کہیں باہر سے مستعار نہ لیا جائے، بلکہ یہ معنوی وجود حاصل ہو ہمارے وطن کے اس سلسلۂ ارتقا کا، جو ہزار ہا سال سے اس ملک میں جاری ہے جسے پہلے تو آریائی فکر و ذہن نے ہو بخشا، اور پھر صدیوں تک مسلمان اس کو سنوارنے اور ترقی دینے میں لگے رہے۔ مولینا کا کہنا یہ ہے کہ ہمارا یہ معنوی وجود ہندوؤں اور مسلمانوں کی تاریخی جدوجہد اور ان کے ہزار ہا سال کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔ اور آج ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے وطن کے اس معنوی وجود کی بنیادوں پر اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق ایک آزاد جمہوری، صنعتی اور سوشلسٹ ہندوستان کی تعمیر کریں۔ مولینا کے نزدیک ہندوستان کے اس معنوی وجود کے بہترین شارح اور آخری ترجمان شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی ہیں۔ شاہ صاحب ایک بلند نظر فلسفی بھی ہیں۔ وہ ایک مسلّمہ مذہبی عالم بھی ہیں اور اکبر اور عالمگیر کے بعد جب مسلمانوں کا بادشاہی دور ختم ہو رہا تھا تو انہوں نے جمہور مسلمانوں کے سامنے ایک نئے نظام کا فکر بھی پیش کیا۔ جس پر ان کے بعد انہوں اور ان

نے اپنی ایک سیاسی پارٹی بنائی، اور اس پارٹی نے عملی جدوجہد بھی کی۔ مولینا فرماتے ہیں کہ جہاں تک شاہ صاحب کے فلسفی فکر کا تعلق ہے، وہ خالص انسانی ہے، اس میں کسی مذہب اور ملت سے بحث نہیں۔ شاہ صاحب کے اس فکر کا اساس عقیدہ وحدت الوجود ہے جس کو ہندو بھی مانتے ہیں اور مسلمان صوفیا بھی اس کے قائل تھے۔ چنانچہ اس ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو بحیثیت دو انسانی گروہوں کے یہ فلسفی فکر ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب لا سکتا ہے۔ آپس کی اس فکری مقاربت کے بعد ہندو اپنی تاریخی روایات اور مذہبی ضابطوں پر اجتماعی زندگی بسر کریں اور مسلمان اپنے دینی اصولوں اور فقہی قاعدوں پر۔ اس مسئلہ میں شاہ صاحب ایک مسلمہ مذہبی عالم کی حیثیت سے مسلمانوں کے امام اور استاد ہوں گے۔ اس کے بعد مسلمان جمہور کی تنظیم کا سوال آتا ہے۔ مولینا فرماتے ہیں کہ عوام مسلمانوں کی اس طرح کی تنظیم اور انکی سیاسی جدوجہد جسے وہ ولی اللہی تحریک کا نام دیتے ہیں، اس کا سلسلہ ۱۷۳۱ء سے جاری ہے۔ جس میں اب تک نئے نئے حالات کے مطابق برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ مولینا کا کہنا یہ ہے کہ آج ہم اس زمانے کی ضروریات کے مطابق جمہور مسلمانوں کی اس تاریخی جدوجہد کو نئی شکل دے سکتے ہیں۔ یہ ہیں تین درجے، مولینا کی دعوت اور انکی عملی سرگرمیوں کے۔ ان سہ گانہ مراتب کی اپنی جدا جدا حیثیت ہے۔ اور ہر حیثیت اپنی جگہ مستقل بالذات ہے۔ اس سلسلہ میں اگر ضرورت سے زیادہ وسیع مشربی برتی گئی اور محض انسانیت کے غیر محدود دائرے کو ہی ہم نے اجتماعی زندگی کی آخری قدر مانا تو اس کا نتیجہ اکبر اعظم کے دین الٰہی جیسا ایک مذہبی تصور ہوگا جس سے فکر کو تو بیشک ایک بے پایاں وسعت مل جائے گی۔ لیکن عملاً اس سے اجتماعی زندگی کو نقصان پہنچے گا۔ اس کے برعکس اگر شاہ صاحب کے فلسفی فکر کو الگ کر کے صرف ان کی مذہبی تجدید ہی کو ہم نے اپنے لئے مدار کل بنایا۔ تو جماعتی اعتبار

سے شاید ہم اپنے ہاں کی اہل حدیث جماعت کی طرح پابند کتاب وسنت ہو جائیں لیکن اس سے عام زندگی میں جو حاصل ہوگا۔ وہ ہم نے گذشتہ ایک سو برس میں دیکھ ہی لیا ہے۔ مولینا کے عمر بھر کے فکر و مطالعہ اور اندرون ہند اور ہندوستان سے باہر کے ملکوں میں برسوں کے تجربات کا اسے ایک اعجاز سمجھئے کہ وہ شاہ ولی اللہ کے فکر و عمل کے ان سہ گانہ مراتب میں مطلق التباس نہیں ہونے دیتے۔ اور وہ انکی بنیادوں پر ہمیں ایک ایسے فکری و سیاسی نظام بنانے کی راہ دکھاتے ہیں۔ جو خالص انسانی، ملی اور اجتماعی اعتبار سے صحیح معنوں میں اسلامی ہے۔ اور آج کی مادی اور معاشی ضرورتوں کے لحاظ سے جدید یورپ کے سب سے ترقی یافتہ صنعتی نظام کے ہم پایہ ہے اور پھر اس نظام کو معرض وجود میں لانے کے لئے مولینا ہم میں انقلابی فکر اور اس پر عمل کرنے کے لئے انقلاب کا ولولہ اور حوصلہ بھی پیدا کرتے ہیں۔

ہندوستان کی فضا میں یہ باتیں بالکل نئی تھیں۔ کیونکہ اب تک کبھی کسی نے ہندوستان کے مسائل پر اس نئے انداز سے نہیں سوچا تھا۔ چنانچہ مولینا جب وطن واپس آئے اور انہوں نے فرداً فرداً عام قومی اور اسلامی اجتماعوں میں اپنے ان افکار و خیالات اور عزائم و مقاصد کا اظہار کرنا شروع کیا، تو اکثر لوگ شروع شروع میں مولینا کو سمجھنے سے بالکل قاصر رہے۔ اور اور گو موصوف کی ذات گرامی سے انھیں جو عقیدت تھی۔ اس کی بنا پر وہ خاموش تو رہے لیکن ان میں سے بہت بڑی تعداد کے لئے مولینا کی یہ باتیں آخر تک ناقابل قبول رہیں۔ اس کے علاوہ ان دنوں لیگ اور کانگرس کے نزاع نے ملک میں ایک بحران پیدا کر رکھا تھا۔ اس لئے اتنا تو ضرور ہوا کہ چند افراد مولینا کے گرد جمع ہو گئے۔ لیکن مسلمانوں کی عام سیاسی جماعتوں نے بدقسمتی سے

مولینا کی دعوت پر زیادہ دھیان نہ دیا۔ چنانچہ مولینا کی زندگی میں انکے بے نظیر دماغ اور ان کی غیر معمولی انقلابی قوتوں سے جو عملی رہنمائی مسلمانان ہند کو مل سکتی تھی، ہماری سیاسی جماعتوں نے مطلق اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔ مولینا اپنی زندگی کے آخری دنوں میں قوم کی طرف ایک "نذیر" بن کر آئے تھے۔ انہوں نے اپنی قوم کو آنے والے انقلاب سے ڈرایا۔ اور انھیں بتایا کہ انقلاب کا وقت معین ہو چکا ہے اور اب وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹلے گا۔ مولینا نے نہ دن کا خیال کیا اور نہ رات کا۔ وہ شب و روز قوم سے اپنی بات کہتے رہے۔ بعض لوگ سنتے اور چل دیتے اور بعض تو سننا بھی گوارا نہ کرتے اور کانوں میں انگلیاں دے لیتے۔ مولینا نے اپنی قوم کو کھلے طور پر بلایا۔ اُن سے برملا بھی باتیں کہیں۔ اور خلوت میں بھی ایک ایک کے پاس اپنا پیغام لے کر گئے اور مارچ ۱۹۳۹ء سے لیکر اگست ۱۹۴۴ء تک کی یہ ساری مدت مولینا نے اس جدوجہد میں گزاری اور ایک لمحہ بھر کے لئے بھی انہوں نے کہیں سستانے کا نام نہیں لیا۔ مولینا کی یہ دعوت ایک نئے دور کے آنے کا اعلان تھا۔ اگر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دیدی اور انہوں نے نئے دور کے اس پیغامبر کی بات کو سمجھ لیا اور وہ اس کے بتائے ہوئے راستے پر ہو لئے تو یقیناً ان کے لئے فوز و فلاح کے دروازے کھلے ہیں، ورنہ جس انقلاب سے مولینا ڈرا رہے تھے۔ اگر اس نے ہمیں اسی حالت میں جس میں کہ ہم اسوقت ہیں، اپنی دار و گیر میں لے لیا تو جو کچھ حضرت نوحؑ کی قوم پر گزری تھی وہ حشر ہمارا بھی ہوگا، اور اپنی عمر بھر کی جان توڑ کوششوں کا یہ افسوسناک انجام دیکھ کر حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح بے شک مولینا عبید اللہ صاحب سندھی بھی اپنے پروردگار کی خدمت میں یہی عرض کریں گے کہ "رب انہم عصونی واتبعوا من لم یزدہ مالہ وولدہ الا خساراً"۔

بیشک ہندوستان کی اسلامی جماعتوں کے بوڑھے رہنماؤں نے مولینا کی زندگی میں انکی دعوت کی صحیح اہمیت کو نہ سمجھا لیکن مرحوم اس کے متعلق بددل نہیں تھے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ وہ مسلم نوجوان اسمبلی کے ممبروں کی سرمایہ داری سے مرعوب ہوکر زیادہ دیر انکے قابو میں نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ مولینا کی توقعات اپنی قوم کے ان نوجوانوں ہی سے وابستہ تھیں، اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "ہمارا اصلی مخاطب صرف ہمارا نوجوان ہے، اور یہی نوجوان آگے چل کر اپنے ملک میں اپنی حکومت بنائے گا۔" مولینا نے مسلمان نوجوانوں کے ہر طبقہ سے خطاب کیا۔ آپنے عربی مدارس کے طلبہ کو بتایا کہ جو دینی علوم وہ پڑھ رہے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابوں کو ان علوم کی تحصیل کا آخری درجہ بنائیں، اور اسکے ساتھ وہ یورپ کے نئے معاشی اور سیاسی انقلاب کو بھی سمجھیں۔ اس سے انکی نظر میں وسعت اور دلوں میں عمل کا ولولہ پیدا ہوگا۔ اور وہ عوام مسلمانوں کی صحیح تربیت کرکے انکے حقیقی ترجمان بن سکیں گے۔ آپنے جمعیت العلماء کے نوجوان کارکنوں کو سمجھایا کہ وہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات کو دیکھیں، اور ۱۹۲۰ء سے جمعیت جس نہج پر چل رہی ہے، اس میں مناسب اصلاح کریں۔ مولینا نے فرمایا کہ تحریک خلافت میں علماء کی ترقی کن جماعت اور انگریزی پڑھے ہوئے انقلابی عناصر ملے تھے تو مسلمان ہندوستان کی تمام سیاست پر چھا گئے تھے، اور اگر آج بھی آپ لوگ ملک کے ان نوجوانوں کو ساتھ لے لیں، جو یورپ کے انقلاب سے خوب واقف ہو چکے ہیں، تو آپ نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ کل ہندوستان کی قسمت بدل سکتے ہیں، لیکن یہ اسوقت تک نہیں ہو سکتا جب تک آپ اپنی انقلابی سیاست میں شاہ صاحب کو اپنا امام نہ مانیں۔ مولینا نے متنبہ کیا کہ اگر آپ لوگوں نے ایسا نہ کیا تو ہندوستان کے مسلمانوں کا وہی حشر ہوگا، جو بخارا کے مسلمان کا ہو چکا ہے۔

مولینا جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو علی گڈھ اور دیوبند کی علمی تحریکوں کا تاریخی سنگم سمجھتے تھے، چنانچہ آپنے یہاں "بیت الحکمت" کے نام سے ایک مرکزی ادارہ بنایا، جہاں عربی مدارس کے فارغ التحصیل علماء اور

انگریزی کالجوں کے پڑھے ہوئے نوجوان آئیں ملکر شاہ صاحب کے علوم کا تحقیقی مطالعہ کریں۔ اور ہندوستان کے اس مرکزی مقام اور جامعہ کی خالص علمی فضا میں رہ کر طلبہ کی یہ جماعت شاہ صاحب کی حکمت کے اصولوں پر آج اس زمانے کے لئے ایک اسلامی ہندوستانی فکر کی تشکیل کرے۔ نیز ہمارے ہاں آئے دن جو سیاسی، معاشی اور اجتماعی مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں "بیت الحکمت" ان میں بھی اہل ملک کی صحیح رہنمائی کرسکے۔

مولانا کی علمی سرگرمیوں کا مرکز تو دہلی، دیوبند اور لاہور رہا لیکن مرحوم نے اپنے انقلابی فکر کو عملی شکل دینے کیلئے سندھ کی سرزمین کو منتخب فرمایا تھا۔ سندھ سے مولینا کو بیحد محبت تھی۔ اور وہ اپنی عمر کے پہلے حصے میں سندھ میں ایک عرصہ تک کام بھی کر چکے تھے لیکن مرحوم نے سندھ کو محض اسی بناء پر اپنی عملی جدوجہد کا مرکز نہیں بنایا تھا بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ مولینا کے پیش نظر انقلاب کا جو تصور تھا۔ اس کیلئے سندھ کے حالات خاص طور پر سازگار ہیں۔ اور سندھی مسلمان اور سندھی ہندو بڑی آسانی سے مرحوم کے مشترکہ سیاسی فکر کو اپنا بھی سکتے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑی چیز جسکی مولینا کو تلاش تھی، وہ سندھ کے عربی مدارس کے نوجوان علماء میں موجود ہے۔ مولینا چاہتے تھے کہ علماء اسلام کو شاہ صاحب کی انقلابی سیاست کی صورت میں سمجھیں۔ اور نیز یورپ کے نئے انقلاب سے بھی وہ بیخبر نہ رہیں۔ ج، ن۔ سندھ ساگر نام کی سیاسی پارٹی اور محمد قاسم تھیوجیکل اسکول و کالج نام کی درسگاہیں مرحوم کے انہی تصورات کے عنوان ہیں۔

دہلی اور سندھ ۔۔۔ ایک مولینا کا مرکز فکر اور دوسرا ان کا مرکز عمل۔ ہندوستان کی سیاسی بساط اب الٹنے کو ہے۔ نئے دور میں اگر مسلمانوں کو ایک فعال اور صالح جماعت کی حیثیت سے ہندوستان میں رہنا ہے تو اس کا انحصار زیادہ تر اس پر ہے کہ مسلمان مولینا کے فکر و عمل کو کہاں تک اپنے لئے مشعل راہ بناتے ہیں۔ مولینا تو اپنے رب کے ہاں سدھارے۔ اب مرحوم کے فکر اور عمل کو زندہ رکھنا دہلی اور سندھ کا فرض ہے۔

خود نوشتہ حالاتِ زندگی

پچیس سال کی جلاوطنی کے بعد مولینا کو ہندوستان واپس آنے کی اجازت ملی، تو اس موقعہ پر ملک کے بعض اخبارات نے مولینا کے حالاتِ زندگی شائع کئے۔ ان میں تحسین و توصیف کے سلسلہ میں کہیں کہیں مبالغہ سے کام لیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر ایک مضمون نگار نے لکھا تھا کہ مولینا جب ماسکو میں قیام فرما تھے تو لینن کی بیوی خود اپنے ہاتھوں سے مولینا کے لئے وضو کا پانی گرم کرتی تھی۔ حضرت مولینا کو اپنی ذات کے متعلق اس قسم کی مدح سرائی سخت ناپسند تھی۔ چنانچہ آپ نے مکہ معظمہ میں ان مضامین کو پڑھا، تو خود اپنے قلم سے اپنی زندگی کے حالات لکھے اور روزنامہ "انقلاب" کو شائع کرنے کے لئے ارسال فرمائے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

لاہور کے اخبارات میں میرے متعلق محبت آمیز مقالات شائع ہو رہے ہیں۔ میں مقالہ نگار عزیزوں کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن میری شخصیت اور ابتدائی تعلیم اور عام حالات میں اس قدر فحش غلطیاں موجود ہیں کہ میں بدوں شرم محسوس کئے نہیں رہ سکتا۔ اس لئے تصحیح کے لئے چند واقعات مختصراً لکھنے پر مجبور ہوں۔

میرا خاندان اور مولد

میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں (جیانوالی) میں پیدا ہوا ہمارے خاندان کا اصلی پیشہ زرگری ہے۔ لیکن عرصہ سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا۔ اور بعض افراد صاہو کارہ بھی کرتے رہے۔

میں عموماً حضرت سلمان فارسی کے اتباع میں اپنا نام عبیداللہ بن اسلام لکھا کرتا ہوں۔ مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار سے والد کی طرف منسوب کر کے لکھنا پڑا تو عبیداللہ بن ابی عائشہ لکھا۔ میری بڑی ہمشیرہ کا نام "جیونی" تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اگر کسی نے اس سے زیادہ تشریح کے لئے کہا تو عبیداللہ ابن راما بن رائے لکھوں گا۔ میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کے کاردار تھے۔

پیدائش اور یتیمی میں شب جمعہ قبل صبح ۱۲ محرم ۱۲۸۹ھ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوا۔ میرا باپ چار ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ دو سال بعد دادا بھی مر گیا تو میری والدہ مجھے ننھیال میں لے آئی یہ ایک خالص سکھ خاندان تھا۔ میرے نانا کی ترغیب پر ہی میرا والد سکھ بن گیا تھا۔ میرے دو ماموں جام پور ڈیرہ غازی خاں میں پٹواری تھے۔ جب نانا فوت ہوا تو ہم ان کے پاس چلے آئے میری تعلیم ۱۸۷۸ء سے جام پور کے اردو مڈل اسکول میں شروع ہوئی ۱۸۸۷ء میں مڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اظہار اسلام کے لئے گھر چھوڑ دیا۔ اس دوران میں دو سال کے لئے میں ضلع سیالکوٹ میں رہا۔ اسلئے ایک سال اپنی جماعت سے پیچھے رہ گیا۔ ورنہ اپنے اسکول میں شروع سے ممتاز طالب علم مانا جاتا تھا۔

مطالعہ اسلام ۱۸۸۴ء میں مجھے اسکول کے ایک آریہ سماجی لڑکے کے ہاتھ سے

تحفۃ الہند ملی۔ میں اس کے مسلسل مطالعہ میں مصروف رہا اور بالتدریج اسلام کی صداقت پر یقین بڑھتا گیا۔ ہمارے قریب کے پرائمری اسکول (کوٹلہ مغلان) سے چند دوست بھی مل گئے جو میری طرح تحفۃ الہند کے گرویدہ تھے۔ انھیں کے توسط سے مجھے مولانا اسمعیل شہید کی "تقویۃ الایمان" ملی۔ اس کے مطالعہ نے اسلامی توحید اور پرانک شرک اچھی طرح سمجھ میں آگیا۔ اس کے بعد مولوی محمد صاحب لکھنوی کی کتاب احوال الآخرت پنجابی ایک مولوی صاحب سے ملی۔ اب میں نے نماز سیکھ لی اور اپنا نام تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر عبید اللہ خود تجویز لیا۔

احوال الآخرت کا بار بار مطالعہ اور تحفۃ الہند کا وہ حصہ جس میں نومسلموں کے حالات لکھے ہیں یہی دو چیزیں جلدی اظہار اسلام کا باعث بنیں۔ ورنہ اصلی ارادہ یہ تھا کہ جب کسی ہائی اسکول میں اگلے سال تعلیم کے لئے جاؤں گا تو اسوقت اظہار اسلام کروں گا۔

۱۵ اگست ۱۸۸۷ء کو توکلاً علی اللہ نکل کھڑا ہوا۔

اظہار اسلام میرے ساتھ کوٹلہ مغلان کا ایک رفیق عبد القادر تھا۔ ہم دونوں عربی مدرسہ کے ایک طالب علم کے ساتھ کوٹلہ رحم شاہ ضلع مظفر گڑھ میں پہنچے۔ ۹ ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ کو میری سنت تطہیر ادا ہوئی۔ اس کے چند روز بعد جب میرے اعزہ تعاقب کرنے لگے تو میں سندھ کی طرف روانہ ہوگیا۔ عربی صرف کی کتابیں میں نے راستہ میں اس طالب علم سے پڑھنا شروع کردی تھیں۔

سید العارفین کی صحبت اللہ کی خاص رحمت سے جس طرح ابتدائی عمر میں اسلام کی سمجھ آسان ہوگئی۔ اسی طرح کی خاص رحمت کا اثر یہ بھی ہے کہ سندھ میں میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈی والے کی خدمت میں پہنچ گیا جو اپنے وقت کے جنید اور سید العارفین تھے۔ چند ماہ میں ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لئے طبیعت ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔ حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب فرمایا (غالباً مولانا ابو الحسن امروٹی جن کا ذکر آگے آئے گا اس مجمع میں موجود تھے) کہ عبید اللہ نے اللہ کے لئے اپنے ماں باپ کو چھوڑا۔ اسلئے اب اسکے ماں باپ ہم ہیں۔ اس کلمہ مبارک کی تاثیر خاص میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں انھیں بنیادی باپ سمجھتا ہوں! اور اسی لئے سندھ کو مستقل وطن بنایا یا بن گیا۔ میں نے قادری راشدی طریقہ میں ان سے بیعت کر لی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ محسوس ہوا کہ بڑے نسان سے بہت کم مرعوب ہوتا ہوں۔ تین چار ماہ بعد میں طالب علمی کے لئے رخصت ہوا۔ اب مجھے بتایا گیا کہ حضرت نے میرے لئے خاص دعا فرمائی "خدا کرے عبید اللہ کا کسی راسخ عالم سے پالا پڑے"۔ میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی۔ اور اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل سے مجھے حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ کی خدمت میں پہنچا دیا۔

سید العارفین کے خلیفہ - بھرچونڈی سے رخصت ہو کر میں اس طالب علم

کے ساتھ ریاست بہاولپور کی دیہاتی مسجدیں ابتدائی عربی کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نقل وحرکت میں دین پور پہنچا جہاں سید العارفین کے خلیفہ اول مولانا ابو السراج غلام محمد صاحب رہتے تھے۔ ہدایۃ النحو تک کتابیں میں نے یہیں مولانا عبد القادر صاحب سے پڑھیں۔ حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا۔ وہ آگئی اور واپس لے جانے کیلئے بہت زیادہ زور لگایا۔ مگر میں بحمد اللہ ثابت قدم رہا (یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہنچی) شوال ۱۳۰۵ھ میں دین پور متصل خان پور سے کوٹلہ رحم شاہ چلا آیا اور مولوی خدا بخش صاحب سے کافیہ پڑھا۔ یہیں ایک نووارد طالب علم سے ہندوستانی مدارس عربیہ کا حال معلوم ہوا۔ اور میں اسٹیشن مظفر گڑھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیوبند پہنچا۔ صفر ۱۳۰۶ھ کو میں دار العلوم دیوبند میں داخل ہوا۔

دار العلوم دیوبند

تخمیناً پانچ مہینے میں قطبی تک منطق کے رسائل متفرق اساتذہ اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی۔ ایک فاضل استاد کی مہربانی سے طریقہ مطالعہ سیکھ لیا اور محنت سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔

حکمت ومنطق کی کتابیں جلدی ختم کرنے کے لئے چند ماہ مولانا احمد حسن صاحب کانپوری کے مدرسہ میں چلا گیا اور پھر چند ماہ مدرسہ عالیہ رامپور میں رہ کر مولوی ناظر الدین صاحب سے کتابیں پڑھ لیں۔ اسی طرح صفر سنہ ۱۳۰۷ھ کو پھر دیوبند واپس آگیا۔

حضرت مولانا شیخ الہند رح دیوبند میں دو تین مہینے تک مولانا حافظ احمد صاحب
سے پڑھتا رہا۔ اس کے بعد مولانا شیخ الہند کے درس
میں شامل ہوگیا۔ سنہ ۱۳۰۲ھ کو ہدایہ۔ تلویح۔ مطول، شرح عقائد، مسلم الثبوت
میں امتحان دیا اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولانا سید احمد صاحب
دہلوی مدرس اول نے میرے جوابات کی بہت تعریف کی۔ فرمایا اگر اس کو
کتابیں ملیں تو شاہ عبدالعزیز ثانی ہوگا۔ چند دوستوں نے مبشر خواب دیکھے ہیں
نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور ابو حنیفہ رضی
اللہ عنہ کو بھی خواب میں دیکھا۔ رمضان شریف میں اصول فقہ کا ایک رسالہ
لکھا۔ جسے حضرت شیخ الہند نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح پیش کئے کہ
جہاں اہل علم محققین کی رائے کو ترجیح دی تھی مثلاً تاویل المتشابہات ناممکن الحصول
نہیں بلکہ راسخین فی العلم وہبی علم سے جانتے ہیں۔

شوال سنہ ۱۳۰۲ھ سے تفسیر بیضاوی اور دورۂ حدیث میں شریک ہوا۔
جامع ترمذی حضرت مولانا شیخ الہند سے پڑھی اور سنن ابی داؤد کے لئے حضرت
مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت میں گنگوہ پہنچا

جہاں آباد دہلی بیمار ہو کر گنگوہ سے دہلی آیا حکیم محمود خاں کے علاج سے
افاقہ ہوا۔ حدیث کی باقی کتابیں مولوی عبدالکریم صاحب پنجابی
دیوبندی سے جلد جلد ختم کرلیں۔ مجھے یاد ہے کہ سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں

نے چار چار دن میں پڑھی ہیں اور سراجی دو گھنٹہ میں ختم کی مولوی صاحب حضرت مولانا قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے غیر معروف محقق شاگرد تھے۔ اثنائے قیام دہلی میں دو دفعہ حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب کی زیارت کو گیا۔ صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں دو سبق بھی سُنے۔

معاودت سندھ ۲۰ رجمادی الثانیہ ۱۲۰۰ھ کو دہلی سے سید حافظ چھنڈی ضلع سکھر پہنچا (اس تمام سفر میں ایا بادو دہا بالاہور نہیں اترا اور چینیاں والی مسجد میں نہیں گیا) میرے مرشد میرے آنے سے دس دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ رجب ۱۳۰۱ھ میں حضرت شیخ الہند نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیج دیا اور مولوی کمال الدین صاحب نے مجھ سے سنن ابی داؤد پڑھی

سید العارفین کے دوسرے خلیفہ شوال ۱۳۰۱ھ سے سید العارفین کے دوسرے خلیفہ مولانا ابو الحسن تاج محمود صاحب کے پاس امروٹ ضلع سکھر میں چلا گیا۔ انہوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا وہ میرے لئے بمنزلہ باپ تھے۔ میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ اسکول کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خاں یوسف زئی کی لڑکی سے کرایا میری والدہ کو بلایا۔ وہ میرے پاس آخر وقت تک اپنے طرز پر رہی۔ میرے مطالعہ کے لئے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں ان کے ظل عاطفت میں ۱۳۱۵ھ تک باطمینان مطالعہ کرتا رہا۔

کتب خانہ پیر صاحب العلم گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد میں راشدی طریقہ کے پیر صاحب العلم کے پاس علوم دینیہ کا بے نظیر کتب خانہ تھا میں دوران مطالعہ میں وہاں جاتا رہا اور کتابیں مستعار بھی لاتا رہا۔ میری تکمیل مطالعہ میں اس کتبخانہ کے فیض کو بڑا دخل تھا۔

حضرت پیر صاحب العلم کی صحبت اس کے علاوہ حضرت مولانا رشید الدین صاحب العلم الثالث کی صحبت سے مستفید ہوا۔ میں نے ان کی کرامتیں دیکھیں ذکر اسمار الحسنیٰ میں نے انھیں سے سیکھا۔ وہ دعوت توحید وجہاد کے ایک مجدد تھے حضرت مولانا ابو التراب رشد اللہ صاحب العلم الرابع سے علمی صحبتیں رہیں۔ وہ علم حدیث کے بڑے جید عالم اور صاحب تصانیف تھے۔ ان کے ساتھ قاضی فتح محمد صاحب کی علمی صحبت بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔

میری علمی تحقیقات کا مرکز اللہ کی رحمتوں میں سے ایک نعمتِ عظمیٰ جس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا یہ ہے کہ فقہ وحدیث کی تحقیق سے تطبیق میں اور ایسا ہی قرآن عظیم کی تفسیر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی سے شروع کر کے امام ولی اللہ دہلوی تک، سلسلۂ علماء میرا رہبر بنا اور میں نے ان کو اپنا امام بنا لیا۔ مجھے اپنی علمی اور سیاسی ترقی میں اس سلسلہ سے باہر کبھی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس سے میری تمام کوششیں اصولی

طور پر منظم ہو گئیں اور میں اسلام کی فلاسفی سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ میں نے دہلی میں قبلہ نما کا مطالعہ کیا اس کے معارف میری روح سے پیوستہ ہو گئے حدیث کی تحقیق میں حجۃ اللہ کا تعارف مولانا شیخ الہند نے کرایا تھا۔ آخر میں اسی کے مطالعہ سے مجھے اطمینان نصیب ہوا میں نے علماء کی ایک جماعت کو حجۃ اللہ پڑھائی اور کافی عرصہ بعد حضرت شیخ الہند سے پڑھی۔

طریقہ قادریہ اس عرصہ میں طریقہ قادریہ اور نقشبندیہ مجددیہ کے اشغال و اذکار بھی حسب الاستطاعت حضرت سید العارفین کے خلیفہ اعظم مولانا ابو السراج دین پوری سے سیکھتا رہا اگر میری کوئی دنیاوی ضرورت امروٹ میں پوری نہ ہوتی تو دین پور سے حاصل کر لیتا اس طرح مجھے اپنے مرشد کی جماعت سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

میرا سیاسی میلان دوران مطالعہ میں مولانا محمد اسمٰعیل شہید کی سوانح عمری دیکھی۔ اسلامی مطالعہ کی ابتدار سے میرا قلبی تعلق مولانا مرحوم سے پیدا ہو چکا تھا۔ دیو بند کی طالب علمی نے بہت سے واقعات اور حکایات سے آشنا کر دیا تھا مولانا عبدالکریم دیوبندی نے سقوط دہلی کی تاریخ آنکھوں دیکھی بتادی تھی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی صحبت میں انقلاب پنجاب کے تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا پہلے جو کچھ لاہور کے لئے سوچتا تھا اب دہلی کے لئے سوچنے لگا۔ مولانا شہید

کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لے کر میں نے اپنا سیاسی پروگرام بنا لیا۔ وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی۔ مگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے حجۃ اللہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کر لیا۔ اس طرح اپنے خیالات کے موافق آہستہ آہستہ کام شروع کر دیا۔

معاودت دیوبند

۱۳۱۵ھ میں دیوبند پہنچا اپنے مطالعہ کا نمونہ دو رسالے لکھ کر ساتھ لے گیا ایک علم حدیث میں دوسرا فقہ حنفی میں۔ حضرت مولانا نے دونوں رسالے پسند فرمائے اس دفعہ دس بارہ حدیث کی مشہور کتابوں کے اطراف سنا کر دوبارہ شفہاً اجازت حاصل کی۔

بعض مسائل جہاد کے ضمن میں ہماری اس جماعت کا ذکر آ گیا حضرت مولانا نے اسے بہت پسند فرمایا اور چند اصلاحات کا مشورہ دے کر اس کو اتحاد اسلام کی کڑی بنا دیا۔ اس کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی اس کے بعد میرے تعلیمی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ سے وابستہ ہو گئے۔

دار الرشاد گوٹھ پیر جھنڈا

امروٹ واپس آکر میں نے مطبع قائم کیا! دو سال تک چلا یا بعض عربی اور سندھی کتابیں جو نایاب تھیں طبع ہوئیں اس کے بعد ایک ماہوار رسالہ "ہدایت الاخوان" چھپتا رہا اس کے بعد مدرسہ بنانے کی کوشش جاری کی مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارا کام بغیر مدرسہ کے چل نہیں سکتا تھا اس کے لئے دوسری جگہ کی

تلاش میں تھا کہ حضرت مولانا راشد اللہ صاحب العلم الرابع نے ۱۳۱۹ھ میں میری تجویز کے موافق مدرسہ بنانے کا ارادہ کیا یہ نام بھی میری تجویز سے مقرر ہوا میں اس میں شریک ہوا سات سال تک علمی اور انتظامی کامل اختیارات کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اکابر علماء میں سے حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی امتحان کے لئے تشریف لائے اس مدرسہ میں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں کی اور امام مالکؒ کو بھی خواب میں دیکھا۔

جمعیۃ الانصار دیوبند ۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہند نے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سُنکر دیوبند رہ کر کام کرنے کیلئے حکم دیا، اسکے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہیگا چار سال تک جمیعت الانصار میں کام کرتا رہا اس جمیعۃ کی تحریک تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابو محمد احمد لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے۔

نظارۃ المعارف دہلی حضرت شیخ الہند کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا ۱۳۳۱ھ میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔ اسکی سرپرستی میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خانصاحب اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح پر شریک تھے۔ حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند میں رہ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا۔ اسی طرح دہلی بھیج کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا اور ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابو الکلام اور مولانا محمد علی مرحوم سے ملایا، اس طرح تخمیناً دو سال ۔

مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔

ہجرت کابل ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا۔ مجھ کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا۔ اس لئے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان پہنچ گیا۔

دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے نہیں تبلایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے۔ انھوں نے بھی اگرچہ اپنا نمائندہ بنایا مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہیں تبلا سکے۔

کابل جاکر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لئے تیار ہے۔ اس میں میرے جیسے ایک خادم کی شیخ الہند کو اشد ضرورت تھی اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لئے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا۔

یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی

کابل بنائی جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ یہ برٹش ایمپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور اس پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریذیڈنٹ ہوں۔

۱۹۲۲ء میں ترکی جانا ہوا سات مہینے ماسکو میں رہا۔

سیاحت روس سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا اس لئے سویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا۔ اور مطالعہ کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں (یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا۔ کامریڈ لینن اس وقت ایسا بیمار تھا کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا)

میرے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ کے فلسفہ کی ایک شاخ ہے اس زمانہ کے لادینی حملہ سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔

میں اس کامیابی پر اول انڈین نیشنل کانگریس، دوم اپنے ہندوستانی نوجوان رفقا جن میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی، سوشلسٹ اور نیشنلسٹ بھی، سوم سویٹ روس کا ہمیشہ ہمیشہ ممنون ہوں اور شکر گزار رہوں گا۔ اگر ان تینوں طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصص اور امتیاز کو کبھی بھی حاصل نہ کر سکتا۔ (فالله الحمد وحده)

نئی ترکیا ۱۹۲۳ء میں انقرہ پہنچا میرے لئے سفیر ترکیہ متعین ماسکو اور وزارت خارجہ ماسکو نے مل کر سفر کا راستہ متعین کر دیا تھا اور برطانوی کارندے اس کا پتہ نہیں لگا سکے (یہ غلط ہے کہ میں استنبول اس زمانہ میں پہنچا جب برطانیہ اور فرانس اس پر قابض تھے) تخمیناً تین سال میں ترکی میں رہا ہوں۔ میں نے تحریک اتحادِ اسلام کا تاریخی مطالعہ کیا ہے۔ مستقبل قریب میں اس کے لئے کوئی مرکز نظر نہ آیا۔ اس لئے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو انڈین نیشنل کانگریس میں داخل کرنا ضروری سمجھا اور کانگریس میں اپنے اصول کی ایک پارٹی کا پروگرام چھاپ دیا۔ جس سے میری مذہبی تحریک ہر ایک مخالف انقلاب سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

ہمارا پروگرام یورپ کو اس طرح اسلام کا تعارف کرانے میں میرا خیال ہے کہ میں اپنے استاذ الاستاذ اور امام مولانا محمد قاسم دیوبندی کی ایک قلبی خواہش کو عملی جامہ پہنا تا رہا ہوں۔

اس پروگرام کو ترکی پولیس سے شائع کرنے کے لئے انقرہ گورنمنٹ کی اجازت حاصل کی گئی۔ وزارت خارجیہ نے ۲ دو مترجموں سے ترجمہ کرا کے جب تک اس کا حرف حرف نہیں پڑھ لیا اجازت نہیں دی۔ بعض ہندو دوست اردو نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ان کی سہولت کے لئے میں نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر دیا۔ استنبول میں لالہ لاجپت رائے سے تبادلہ افکار ہوا۔ اور ایسا ہی ڈاکٹر انصاری

سے اچھی طرح باتیں ہوئیں۔ ہمارے بزرگ نہ اسے مان سکتے ہیں۔ نہ اس کا اچھا بدل بتلا سکتے ہیں۔ اور کوشش کریں گے کہ ہمیں ہزار دو ہزار سال پہلے زمانہ میں لیجا کر کھڑا کر دیں۔ البتہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک آدھ فقرہ اس کی پسندیدگی پر لکھا ہے وہ میرے لئے باعث سرور ہے۔

میں نے اپنے پروگرام میں عدم تشدد کو ضروری قرار دیا ہے اس میں مہاتما گاندھی کا ممنون ہوں۔ میں عدم تشدد کو اخلاقی اصول مانتا تھا۔ لیکن اس بنا پر پولٹیکل پروگرام کی تشکیل اور اس کی اہمیت میں نے گاندھی جی سے سیکھی ہے۔ گاندھی جی نے مجھے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم یاد دلا دی۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام سے پہلے دور میں اسی اصول سیاسی پر عمل ہوتا رہا ہے۔ کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن حیث وجدہا فہو احق بہا۔

مکہ معظمہ پہنچنا: ۱۳۴۴ھ میں موسم حج پر مکہ معظمہ میں موتمر خلافت منعقد ہوئی میرے تمام دوست اس میں آ رہے تھے۔ میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر اٹلی کے راستے سے مکہ معظمہ پہنچنے کی کوشش کی مگر میں موتمر ختم ہونے کے بعد صفر ۱۳۴۵ھ میں پہنچا۔ میں اپنی پوزیشن صحیح طور پر پہچانتا تھا۔ میں نے حجاز گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ یہاں میں کوئی سیاسی پروپگنڈا نہیں کروں گا۔ اس نے مجھے بطور سٹلمنٹ تسلیم کر لیا۔ اس وجہ سے ایک طرح میں محفوظ ہو گیا۔ اگر کبھی جزوی امداد کی میں نے درخواست کی تو حکومت نے اسے پورا کر دیا۔ میرے اپنے طور پر رہنے میں اولیاء امور حارج نہیں ہوئے۔

اس لئے وہ میری طرف سے بہت بہت شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں جزاہم اللہ خیرا۔

علماء مکہ سے استفادہ مجھے اہل مکہ میں سے تین ہندوستانی اور ایک عرب خاندان نے خاص طور پر علمی امداد دی سب سے پہلے شیخ عبدالوہاب دہلوی حاجی علی جان والے دوسرے عبدالستار بن عبدالوہاب دہلوی مرحوم تیسرے ابوالشرف مجددی۔ ان کے کتب خانوں سے میں نے استفادہ کیا۔ عرب خاندان سے میری مراد شیخ محمد بن عبدالرزاق بن حمزہ شیخ دارالحدیث مکہ اور شیخ ابوالسمح عبدالظاہر امام الحرم کا خاندان ہے۔

میرا علمی مشغلہ میں یقیناً ۱۳۔۱۴ سال سے قرآن عظیم اور حجۃ اللہ البالغہ کا بنظر عمیق مطالعہ کرتا رہا۔ تفسیر قرآن میں جس قدر مقامات میرے لئے مشکل تھے اس زمانہ میں انھیں امام ولی اللہ دہلوی کے اصول پر باطمینان حاصل کر سکا۔ جو لوگ میری طرح امام ولی اللہ دہلوی کو نہیں مان سکتے ان کو مطمئن کرنے کا دعویٰ میں نہیں کر سکتا۔ لیکن اب مجھے اپنے اصول پر قرآن عظیم میں اس زمانہ میں قابل عمل تعلیم کا ایک علمی نصاب نظر آیا۔ اس میں اس تجلی ریز مقدس مقام کی تاثیر ضرور ماننا پڑتی ہے میں نے امام ولی اللہ دہلوی کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا مثلاً بدور بازغہ۔ خیر کثیر تفہیمات الٰہیہ۔ سطعات۔ الطاف القدس۔ لمعات وغیرہ۔ ان کی کتابوں کے لئے بطور مفتاح میں نے مولانا رفیع الدین دہلوی کی تکمیل الاذہان اور مولانا اسمٰعیل شہید کی عبقات اور مولانا محمد قاسم کی قاسم العلوم اور تقریر دلپذیر اور

آب حیات کو استعمال کیا۔ مجھے ان کتابوں کے پڑھانے کا بھی موقع ملتا رہا اور ساتھ ہی مدارستہ قرآن عظیم بھی جاری رہا۔ اس سے میرے نظریات بہت وسیع ہو گئے للّٰہ الحمد

امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا مدرسہ

اگر مجھے موقعہ دیا جائے کہ میں امام ولی اللہ دہلوی کو حکمۃ کا مجتہد مستقل فرض کروں اور امام عبدالعزیز دہلوی اور مولانا رفیع الدین دہلوی کو اس حکمۃ کا منتسب اور مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا محمد قاسم کو مجتہد فی المذہب کے رتبہ پر تسلیم کروں تو میں اس حکمت کا ایسا اسکول قائم کر سکتا ہوں جس میں (الف) قرآن عظیم۔ (ب) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسنت الخلفاء الراشدین (ج) تاریخ اسلام کی پوری عقلی تشریح ممکن ہو۔

اس کے بعد تمام مذاہب عالم اور انکی کتب مقدسہ کی تحقیق وتطبیق اسی اصول پر آسان ہو جائیگی (ذٰلک من فضل اللہ واللہ ذو الفضل العظیم)

مراجعت وطن

۱۹۳۶ء سے انڈین نیشنل کانگریس نے میری واپسی کے متعلق کوشش شروع کی اور میرے تمام دوست اسی کی تائید میں کام کرتے رہے۔ اس میں سیاسی مسلک کے اتحاد و اختلاف کا کوئی فرق نہیں رہا۔ اس طرح کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ مجھے یکم نومبر ۱۹۳۷ء کو اجازت واپسی وطن کی اطلاع ملی اور یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو پاسپورٹ دینے کا فیصلہ معلوم ہوا۔ حج کا موسم قریب آگیا۔ اس لئے ادائے مناسک سے فراغت پر واپسی کا ارادہ ہے۔ (واللہ الموفق)

ہندوستان میں پروگرام

ہندوستان میں میرا پروگرام اس کے قریب قریب ہوگا۔

(۱) انڈین نیشنل کانگریس کا معمولی ممبر تو ہمیشہ رہوں گا تاکہ عدم تشدد کے متعلق میری ذمہ داری میرے قومی قانون کے اندر منضبط رہے اور میں پریشان دوستوں کی متشوش حرکات سے محفوظ رہ سکوں۔ لیکن کانگریس کی کسی پارٹی کے عملی حصہ میں شرکت نہیں کروں گا۔

(۲) میرا محبوب مشغلہ فلسفہ امام ولی اللہ کی تعلیم واشاعت ہوگا۔ میں اعلیٰ طبقہ اہل علم کو اس طرف متوجہ کروں گا۔ اس میں دینی عالم اور دانشمند لوگ مخاطب ہوں گے۔ اگر کوئی غیر مسلم ہندو۔ مسیحی۔ آزاد منش اس فلسفہ کا مطالعہ پسند کرے گا تو اس کی پوری امداد کروں گا۔

(۳) جب کبھی حالات مناسب پیدا ہوئے تو میں نیشنل کانگریس میں فلسفہ امام ولی اللہ کی روشنی میں اقتصادی اصول پر اپنی مستقل پارٹی تشکیل کروں گا۔

(واللہ المستعان وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین)

جبال الصولیۃ بلد اللہ الحرام

خطبۂ صدارت

علمائے صوبہ بنگال کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں

۳ ؍ جون سنہ ۱۹۳۹ء کو پڑھا۔

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ - اما بعد - مسلمانان ہند نے اس زمانے میں اپنے اجتماع کی مختلف شکلیں بنا رکھی ہیں - ان میں سے ایک خاص اجتماع جمعیۃ علماء ہند ہے - اس خاص صورت کی ابتدا کیسے ہوئی - اور کس طرح یہ جمعیۃ آج تک اپنی ہستی کا ثبوت دیتی رہی - اس کی تاریخ سے آپ حضرات اس قدر واقف ہیں، جس پر میں کوئی اضافہ نہیں کرسکتا۔

اسی قسم کے اجتماع کی ایک دوسری صورت اس سے پہلے ظاہر ہوچکی ہے - جسے جمعیۃ الانصار، کہا جاتا تھا - اب سنتا ہوں کہ یہ نام کسی دوسرے اجتماع نے اپنے لئے پسند کرلیا ہے، لیکن میری نظر میں اسی نوعیت کے اس اجتماع کا عام پسند نام جمعیۃ علماء ہند ہے -

اس سے پہلے اجتماع سے میرا خصوصی تعلق تھا - حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز واعلیٰ فی العالمین مقامہ کے خدام کے ساتھ میں بھی شریک

عمل رہا ہوں۔ اس قسم کے اجتماع میں شکل وصورت کے بدلنے کا اصل مقصد پر زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے میں اس اجتماع کے مطمع نظر سے اجنبی نہیں ہوں۔

میں نے حضرت شیخ الہند کے حکم سے ۴ شوال ۱۳۳۳ھ کو ہندوستان چھوڑا اور حضرت مولانا حسین احمد مدظلہ کی خواہش پر اوائل ۱۳۵۸ھ میں واپس آیا۔ اس عرصہ میں ایسے حالات سے دوچار ہوتا رہا ہوں کہ کبھی موت کے منہ میں جا کر بچ نکلا اور کبھی غلبۂ یاس کے برے اثرات سے بچنے کے لئے ایسی جماعتوں سے متحد ہو کر کام شروع کیا رہا جن سے بحالت اطمینان شاید معمولی طور پر ملنا بھی جائز نہ سمجھتا۔

یہاں پر مثنوی کے چند اشعار لکھ دوں۔ تو میری کیفیت زیادہ وضاحت سے سمجھ میں آسکے گی ؎

من بہر جمعیتے نالاں شدم	جفت خوشحالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من	وز درون من نجست اسرار من
سر من از نالۂ من دور نیست	لیک گوش و چشم را آں نور نیست!

اس بیان میں، میں اپنے خاص دوستوں کو دعوت دے رہا ہوں کہ وہ ہمارے شخصی حالات کرید کرید کر معلوم کریں۔ انّ فی ذٰلک عبرۃً لاولی الالباب

مجھے وطن آنے کی اجازت ملی۔ میں اسے رحمت الٰہی کا خاص کرشمہ مانتا ہوں۔ آہستہ آہستہ میرے دماغ سے وحشت دور ہو رہی ہے۔ واپسی کی امید منقطع ہونے یا قریب انقطاع پہنچنے سے بہت برے اثرات دل و دماغ پر حاوی ہو رہے

تھے۔ رحمت الٰہی نے اس مشکل میں دستگیری فرمائی اور اس ناقابل برداشت مصیبت سے نجات ملی۔ احمد ربی علی ذالک حمد الشاکرین!

میرے بعض محترم دوست یہ بھی خیال کرتے رہے اور انھیں اس پر اصرار تھا کہ مجھے واپس نہیں آنا چاہیئے غالباً وہ ایسے اوہام میں مبتلا تھے کہ میں آزاد زندگی بسر کر رہا ہوں اس لئے یہاں کی غلامی میں آکر گھبرا جاؤں گا۔ اس وہم نے ان کے دماغ میں مختلف شکلیں اختیار کر لی تھیں مگر میں نے اسے سختی سے ناپسند کیا میری اس سرگذشت کا معاملہ ان کی سمجھ میں نہیں آسکتا ع

کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

پھر میں اللہ رب العزت کا شکر کرتا ہوں۔ کہ ساحل پر قدم رکھنے کے وقت سے آج تک میں نے ڈرانے والوں کے اوہام کا کوئی اثر نہیں دیکھا۔ فللہ الحمد اولاً و آخراً

محسنین کا شکریہ

"لم یشکر اللہ من لم یشکر الناس" کے اصول پر آپ مجھے اجازت دیں۔ کہ جن لوگوں نے میری واپسی کے لئے سعی کی ہے، ان کا شکریہ ادا کروں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے میرے محترم دوست چودھری غلام رسول مہر اور میرے قدیم مہربان سر عبداللہ ہارون نے میرے لئے کوشش شروع کی وہ تحریک اس وقت بعض عارضی وجوہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ مگر کوشش کرنے والوں کی داد نہ دینا ایک طرح کی پست ہمتی اور کفران نعمت ہے۔ اس لئے میں اس اجلاس میں ان کے لئے دعا کرتا ہوں۔ جزاہم اللہ احسن الجزاء!

دوسری دفعہ اس تحریک کو انڈین نیشنل کانگریس نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں چلایا۔ اور میرے دوستوں نے ہند کے ہر گوشہ سے تائید کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ گورنمنٹ ہند نے مجھے واپسی کی اجازت دی۔ اس تحریک کی تائید میں ہر ہندوستانی نے حصہ لیا۔ مسلک سیاسی کے اختلاف کا ان پر کوئی اثر نہیں آیا۔ پھر بھی مجھ سے خصوصی تعلق رکھنے والی جماعتیں مثلاً دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کی شاخیں اور سندھ کی سیاسی اور غیر سیاسی جماعتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس اجازت کے مسئلہ کو اگر بہ نظر عمیق دیکھا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس فیصلہ میں ہز امپیریل میجسٹی کے وزیر ہند کی منظوری ضرور حاصل کی گئی ہے اور یہ بھی صاف طور پر سامنے آجائے گا کہ اگر سندھ گورنمنٹ اپنی ضمانت پیش نہ کرتی تو یہ معاملہ شاید صورت پذیر ہی نہ ہوتا۔ ذرا آگے دیکھا جائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ سندھ گورنمنٹ کو اس ضمانت پر طیار کرنے کے لئے برطانوی وزارت مختار مقیم جدہ اور اس کے معاون انڈین وائس قنصل نے خاص حصہ لیا ہو۔

اس لئے میں (۱) ہز امپیریل میجسٹی اور برٹش کیبنٹ (۲) ہز ایکسلنسی وائسرائے اور انڈین گورنمنٹ (۳) ہز ایکسلنسی گورنر سندھ اور اس کی گورنمنٹ کے معزز اراکین مثل سر غلام حسین ہدایت اللہ (۴) پھر برٹش قائم مقام جدہ اور اپنے محترم دوست سید لال شاہ انڈین وائس قنصل جدہ کا صمیم دل

سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اسی طرح اس کے ساتھ ساتھ بلکہ ایک حیثیت سے پہلے اپنے وطن کے بہت بڑے فلاسفر مہاتما گاندھی اور اپنی قومی جماعت انڈین نیشنل کانگرس جس کا میں سولہ سال سے ممبر ہوں۔ اور اپنی بیرونی زندگی میں اس کے لئے خاص طور پر کام کرتا رہا ہوں۔ اور کانگریس کے سرکردہ ممبروں کا عموماً اور اپنے معزز دوست شری بیت برج لال بیانی ممبر کونسل آف اسٹیٹ اور ڈاکٹر چوئتھ رام سابق پریزیڈنٹ سندھ کانگریس کمیٹی کا خصوصاً اور پھر عام مسلمانوں کی جماعتوں کا اور عام ہندوستانیوں کا شکریہ اسی قدر صمیم قلب سے ادا کرتا ہوں۔

جن حضرات کا شکریہ ادا کر رہا ہوں ان کی یہ ترتیب فقط ظاہری حیثیت سے ہے۔ یہاں میں اس کے بطن کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اس معنوی لحاظ سے سب سے پہلے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مد ظلہ العالی کا نام آتا ہے جو میرے استاد شیخ الہند قدس سرہ کے قائم مقام یعنی ثانی شیخ الہند ہیں۔ اگر مولانا حسین احمد میری واپسی کی خواہش ظاہر نہ کرتے تو میں مشکل اس پر راضی ہوتا کہ گورنمنٹ ہند سے واپسی میں سہولت بہم پہنچانے کے لئے درخواست کر دوں۔

میری نظر میں اس درخواست کو بھیجنے کی کیوں ضرورت تھی۔ اس کی وضاحت کے لئے میں چند فقرات عرض کرتا ہوں۔

میرے خیال میں جب تک میرے محترم رفیق مولانا منصور انصاری مقیم کابل اور میرے محترم دوست راجہ مہندر پرتاپ اسی طرح کی درخواست گورنمنٹ ہند کی خدمت میں نہیں بھیجیں گے۔ اور نیز مہاتما جی کے مسئلہ عدم تشدد کی پابندی کا یقین نہیں دلائیں گے اور اس کے ساتھ اپنے فیصلے سے میری طرح بیرونی تحریکات سے قطع تعلق نہیں کریں گے۔ اس وقت تک گورنمنٹ ہند کسی معاملہ میں نظر ثانی کرنا منظور نہیں کرے گی۔

آپ کا اس قدر وقت لینے کی معافی چاہتا ہوں۔ اور اس شکریہ کی داستان کو ختم کرکے آگے بڑھتا ہوں۔ میں اس سے غافل نہیں ہوں کہ بہت سے میرے خیر خواہ دوست میرے اس قدر طولانی شکریہ کو خوش گواری سے نہیں سنیں گے۔ مگر میرا ادائے فرض پر مجبور ہونا ان کو تلخ باتیں سُنانا ہے۔ میں ان حضرات سے دوبارہ معافی مانگتا ہوں۔ اور آگے چلتا ہوں۔

حضرات! میں اپنے فیصلہ سے کابل نہیں گیا تھا۔ مجھے حضرت مولانا شیخ الہند کا ناقابل تنسیخ حکم ملا۔ اور میرے رفقاء کی مرکزی جماعت نے بھی یہی فیصلہ کیا۔ میں اللہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ خدا نے مجھے تعمیل حکم کی توفیق بخشی!

میرا ارادہ نہیں تھا کہ میں برطانوی گورنمنٹ کے زیر سایہ پھر اس ملک میں آؤں گا، اس لئے دار السلطنت کابل میں مجھ پر فوق العادہ اعتماد کیا گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کے فیصلہ سے کابل چھوڑنا پڑا۔

اور اس کے بعد میں سوویٹ رشیا میں عارضی قیام کے لئے مجبور ہوا۔ ہماری سمجھ میں ہمارے ترک وطن کو اس سے پہلے اگر ہجرت کے مقدس نام سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ تو جیحوں عبور کرنے کے بعد وہ حیثیت ختم ہوگئی۔

اب میں اس حالت میں ہوں۔ کہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ولولا نفر من کل فرقۃ طائفۃ.......

میرا فرض اس صورت میں فقط اس قدر ہے کہ میں اپنی معلومات اپنی جماعت کے سامنے پیش کروں، اور اگر وہ مناسب سمجھیں۔ تو اس سے فائدہ اٹھائیں۔

اس موقعہ پر میں جمعیۃ علماء بنگال کا خاص شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے میرے لئے ایسا موقعہ بہم پہنچایا۔ جہاں سے میں اپنے اجمالی خیالات اپنی قوم اور ملک کے سامنے پیش کردں۔

حضرات! میں ایسے زمانہ میں ہند سے باہر رہا ہوں۔ جسے دور انقلاب کہنا چاہئے۔ بڑی بڑی سلطنتیں فنا کے گھاٹ اُتاری جارہی تھیں۔ ان کی جگہ ہر قوم کے بہادروں کا جو دستہ عمر بھر مصیبتوں میں مبتلا رہا۔ اب پارٹی پالٹیکس کے اصول پر اپنی مختصر جماعت کے زور پر نئی حکومتیں بنا رہا تھا۔ ایسے زمانے میں نئے اور پرانے چوٹی کے سیاسیین سے استفادہ کا موقعہ ملتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اس عالمگیر انقلاب کی حقیقت اور اس کے اساسی اسرار سمجھنے کے قابل ہوگئے۔

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ میں کوئی یوروپین زبان نہیں جانتا۔ اس لئے اس استفادہ میں اپنے نوجوان دوستوں کی امداد کا شکر گذار ہوں۔ میرے یہ نوجوان دوست ہندوستانی تھے۔ یعنی ہندو اور مسلمان اور نیشلسٹ اور سوشلسٹ کا کوئی فرق ان کے سامنے نہیں تھا۔ میں بنگال کا خاص شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میرے محترم دوست پنڈت شب ناتھ نبرجی بھی ان نوجوانوں کی فہرست میں شامل تھے۔

حضرات! جب کہ ہم اس عالمگیر انقلاب کی حقیقت سے آشنا ہو گئے تو اس کے بعد میں اس سے زیادہ اپنے وطن و ملت کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ کہ انھیں یقین دلانے کی کوشش کردں کہ ہندوستان کا اس عالمگیر انقلاب سے متاثر نہ ہونا غیر ممکن ہے۔ اور ان جماعتوں کو جو مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں۔ ایسے طریقے تبلاؤں۔ جس سے وہ نقصان کے مقابلے میں زیادہ نفع حاصل کر سکیں۔

اس وقت میں اپنے بیان کے اجمالی عنوانات کا ذکر کرتا ہوں۔ میں جب سے ساحل ہند پر اترا، مجھے آرام کا کوئی موقعہ نہیں ملا۔ میرے طبعی ضعف اور سفر کا تقاضا ہے کہ اس وقت میں اپنے افکار دلکش صورت میں پیش کرنے کے قابل نہیں ہو سکا۔ اگر مجھے اچھی فرصت ملے۔ تو میں زیادہ مدلل اور واضح شکل میں اپنے افکار آپ کو سناؤں گا۔ مگر اس وقت اس سے زیادہ کی توقع مجھ جیسے عاجز سے نہیں چاہئے۔

(۱) اگر میرا وطن اس انقلاب کے نقصان سے بچنا چاہتا ہے تو اسے یورپین اصول پر نیشنلزم کو ترقی دینا چاہیئے۔ پچھلے زمانہ میں ہمارا ملک جس قدر نامدار رہا ہے۔ اسے دنیا جانتی ہے مگر اس سے ہم کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، جب تک ہم آج کی قوموں میں اپنا وقار ثابت نہ کر سکیں۔ جاننا چاہیئے کہ یہ انقلاب نئی صورت میں پیدا ہو رہا ہے۔ جس میں یورپ کی دو صد سالہ ترقی کام کر رہی ہے! اور اس سے ہمارے عوام قطعاً ناواقف ہیں۔

ہماری ہندوستانی تہذیب کا عہد قدیم جو ہندو تہذیب کہلاتا ہے۔ اور عہد جدید جیسے اسلامی تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ دونوں مذہبی اسکول ہیں۔ اور آجکل کی یورپین اسکول مذہب سے قطعاً نابلد ہے۔ اس کا مدار فقط سائنس اور فلسفہ پر ہے۔ اسی لئے ہمارے وطن میں اگر اس انقلاب کے سمجھنے کی استعداد پیدا نہیں ہوئی تو سر بسر نقصان ہی نقصان ہمارے حصہ میں آئے گا۔

(۲) اس مقصد کی تکمیل میرے خیال میں اس صورت کے سوا ہو ہی نہیں سکتی۔ کہ انڈین نیشنل کانگریس کو تمام سیاسیات ہند کا مرکز بنا دیا جائے۔

مجھے افسوس ہے کہ میرے محترم دوستوں کا نوے فی صدی حصہ مسلم لیگ میں شامل ہے اور وہ یہ امید رکھتے ہیں کہ دنیا لیگ کو کانگریس کے برابر مان لیگی۔ اس لئے وہ پروپیگنڈا پارٹیاں اندرونی اور بیرونی بھیجنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ میں انھیں اس حقیقت سے آشنا کرنا چاہتا ہوں۔ کہ جب سے برطانوی گورنمنٹ

نے منٹو مارلے اسکیم اصلاحات کے مقدمہ میں انڈین نیشنل کانگریس کا ذکر کر دیا۔ اسی وقت سے دنیا گورنمنٹ آف انڈیا کے بعد نیشنل کانگریس کو جانتی ہے۔ اس کے بعد خلافت کے دور میں جب زور سے نان کوآپریشن عمل میں آیا۔ اس نے بھی ملک کی طاقت انڈین نیشنل کانگریس کو تسلیم کرانے میں مدد دی۔ اس قدر گہرے اثرات کی موجودگی میں لوگ ملک کو دھوکا دینا چاہتے ہیں کہ وہ لیگ کو کانگریس کے برابر کر دکھلائیں گے۔ میں اپنے دوستوں کی نیت اور خلوص پر کوئی حملہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں اپنے ملک کو ناواقف نہیں رہنے دوں گا۔ اور ان کو حقائق سے جاہل رکھ کر کسی کو فائدہ حاصل کرنے نہیں دوں گا۔

اس لئے میں سفارش کرتا ہوں کہ نیشنل کانگریس کے کرتا دھرتا یوروپین نیشنلزم کو رواج دینا اپنا نصب العین بنائیں۔ وہ فقط اقتصادی ترقی کو آزادی کی بنیاد قرار دیں۔

ہمارے ملک کے محترم فلاسفر مہاتما گاندھی کی خصوصیات طبعی اور اس کے ارتجاعی میلان کو قوم کا دستور العمل بنانے کی کوشش نہ کریں۔

میں مہاتما جی کا نان وائیلنس کے پولیٹیکل پروگرام میں اعلیٰ درجہ پر احترام کرتا ہوں۔ مگر ان کے میلان خاطر یا ان کے فلسفہ سے پورا متفق نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس مطمع نظر سے بے التفاتی برتنے کا پہلا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہماری وطنی تحریک سے اولاً مولانا شوکت علی مرحوم اور ان کے ساتھی اور ثانیاً محترم

سوبھاش بابو اور اس کے رفیق غیر مطمئن ہو گئے۔
یورپ نے مذہب کا استعمال سیاسیات میں چھوڑ دیا ہے۔ لیکن فلسفہ کو اساس اجتماع بنانے کے لئے مجبور ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ملک کے ہندو اور مسلمان اور سکھ وغیرہ طوائف میں ایسے عالموں کی کمی نہیں کہ وہ اپنی مذہبی روح (یعنی فلسفہ) سے یوروپین اقتصادیات کی تطبیق دے لیں۔ اس سے وہ عوام کو جلدی بیدار کر سکیں گے۔ مگر مذہبی مراسم کو تشنل تحریک کا جزو بنانا خواہ کسی نیک نیتی سے ہو۔ ملک کو تباہی سے نجات نہیں دلائے گا۔

(۳) میں جمعیۃ علمار ہند کو ایک اوّل درجہ کی انقلابی جماعت بنانے کا مشورہ دوں گا۔ اس لئے ضروری ہوگا کہ وہ اسلام کے شارحین سے ہر ایک فریق کی اطاعت نہ کریں۔ کسی غیر انقلابی پر اعتماد نہ کریں، جب تک اس کی مذہبی معلومات اور اس کا طرز زندگی قابلِ اطمینان نہ ثابت ہو چکا ہو۔
اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے میں اپنا امام امام ولی اللہ دہلوی کو بنا چکا ہوں جو اپنی انقلابی سیاست میں اسلام کی صورت اور معنیٰ کا کامل محافظ ہے۔ یورپین انقلابی اس امام کے نظریات سے آگے نہیں بڑھ سکے اور اسلامی علوم و فنون فقہ و حدیث تفسیر و تصوف و حکمت میں اس کی امامت مسلّم ہے۔ اگر ہم اس کی سیاسیات کی توضیح کر سکے تو جمعیۂ علمائے ہند یورپ کے انقلاب کو سمجھنے اور چلانے کی اہلیت آسانی سے پیدا کر سکے گی۔

(۴) میں سفارش کرتا ہوں کہ ہمارے اکابر مذہب و ملت و وطن برٹش گورنمنٹ کے دوصد سالہ عہد سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی کوشش کریں، جس طرح ہم نے یورپ سے تنفر برت کر اپنی ترقی کو محدود کر لیا ہے، اسے اب خیرباد کہیں۔

میں چاہتا ہوں۔ کہ ہمارے کاشتکار اور مزدور کا معیار زندگی بھی یورپ کے باشندوں سے کم نہ رہے۔ اور ملکی ترقی کرنے والی پارٹیاں اس کو اپنا نصب العین بنائیں۔

(۵) میں چاہتا ہوں۔ کہ یورپ کی انٹرنیشنل اجتماعات میں ہمارا وطن ایک معزز ممبر مانا جائے۔ اس کیلئے ہمیں اپنی معاشرت میں انقلاب کی ضرورت ہوگی۔ میں کسی آل انڈیا تحریک شروع کرنے کے لئے اپنی طبیعت میں عملی استعداد نہیں دیکھتا۔ اس لئے سندھ میں بطور نمونہ اس کام کو شروع کروں گا۔ جو انقلاب میں پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی چند مثالیں سناتا ہوں۔

(ا) سندھی زبان جسے ہر ایک سندھی اپنی مادری زبان کی حیثیت میں بولتا ہے، رومن حروف میں لکھے گا اس سے ٹائپ رائٹر سے استفادہ کا جلدی موقعہ ملے گا۔ اور یورپ کے لوگ ہماری زبان آسانی سے سیکھ سکیں گے۔

(ب) سندھی اپنے وطن کا بنا ہوا کپڑا پہنے گا۔ مگر وہ کوٹ و پتلون کی شکل میں ہوگا۔ یا کالر دار قمیض اور نکر کی صورت میں، مسلمان اپنے نکر گھٹنے سے نیچے

تک استعمال کر سکتے ہیں۔ ہیٹ دونوں صورتوں میں بے تکلف استعمال کریگا۔

(ج) ہم نے افغانستان میں دیکھا ہے کہ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں نے سپاہیوں کو بوٹ سمیت نماز پڑھنے کا حکم دے رکھا تھا۔ اس سی وہاں کے عوام مسجد کے دروازہ پر فقہی قاعدہ کے مطابق بوٹ صاف کر کے مسجد میں نماز پڑھ لیتے تھے۔ سندھی عوام اس پر عمل کریں گے۔

(۶) میں کوشش کروں گا۔ کہ جمعیۃ علماء ہند کے دو حصے کر دئے جائیں۔ پہلا حصہ مسلمانوں کے علوم کا محافظ ہو۔ تمام دینی مدارس اور تبلیغ کے اداری اس سیکشن کو رہنما بنائیں۔

اس صنف کے اہل علم کے لئے میں اپنا تجربہ اور اپنی سوچی سمجھی ہوئی رائے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ تاکہ غور و فکر اور فیصلہ میں مدد دے سکوں۔

ہند کے مسلمانوں کو دینی تعلیم دینے کے تین درجہ ہیں۔

(۱) پہلا درجہ یہ ہے کہ مقامی زبانوں میں دینی اصول عوام کے سامنے پیش کئے جائیں۔ یہ طے شدہ مسئلہ ہے کہ کسی قوم کی عمومی تعلیم اس کی مادری زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں ناممکن ہے۔

اس لئے جمعیۃ کے لئے ضروری ہے کہ ہند کی ہر ایک قوم کو جو ایک مستقل زبان بولتی ہوں۔ جیسے سندھی۔ پشتون۔ کشمیری۔ بنگالی۔ اس کی زبان میں اسلام کے پانچ ابتدائی تعلیمات سکھلانے پر اکتفا نہ کرے۔ بلکہ قرآن عظیم کی

منتخب سورتوں کا ترجمہ اور حکیمانہ تفسیر بتلا کر ان کو اعلیٰ مقاصد دین سے بھی آشنا کردے۔

یہاں ضمنی طور پر ایک مسئلہ کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کی زبانیں عام طور پر عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ اس لئے ہر ایک حرف بھی مختلف صورتوں میں لکھنا پڑتا ہے۔ کاروباری عوام کے لئے اس رسم الخط کا سیکھنا آسان نہیں۔ ان کے لئے خاص طور پر مقطع حروف کی رسم الخط ایجاد کرنا ضروری ہے۔ جو اعراب و علامات وقفہ کی اصلاح کے بعد تمام ممالک میں رواج پذیر ہو سکتا ہے۔ وہ بہترین رسم الخط ہوگا۔ اور افغانستان ترکستان۔ ایران اور عربی ممالک میں شائع ہو سکتا ہے۔

(ب) ہندوستانی مسلمانوں کو دوسرے درجہ پر اُردو کے ذریعہ سے اسلامی تعلیم دینا جمعیۃ علمار ہند کا اہم کام ہے۔ اس درجہ پر فارسی اخلاق و تصوف کی کتابیں اور ابتدائی عربی سکھانا بھی ضروری ہوگا۔

تنبیہ۔ میں یہاں بتا دینا چاہتا ہوں۔ کہ اردو اچھی طرح کوئی نہیں لکھ سکتا۔ جب تک وہ گلستان۔ بوستان اور کافیہ تک پڑھا ہوا نہ ہو۔

اس لئے اردو سیکھنے والوں کو تھوڑی سی فارسی گرامر اور ادب جاننا ضروری ہے اور میرا خیال ہے کہ ہندوستان کی اس زبان میں بین الملی زبان بننے کے بہت زیادہ امکانات ہیں۔ اس لئے زباندان علمار کا فرض ہے کہ اس زبان کو سیکھنے کی تمام ضروریات ایک کتاب میں جمع کردیں۔ تاکہ مختلف

اقوام کو سیکھنے میں آسانی ہو۔

اردو میں قرآن عظیم کی تفسیر حدیث و فقہ و تاریخ و تصوف کے اعلیٰ مضامین مسلمانانِ ہند کو مشترک طریقہ سے سکھلائے جائیں۔ اور ہم ان دینی خادموں کی تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔ جنہوں نے قرآن کا پہلے اردو ترجمہ کیا۔ مشکوٰۃ۔ مشارق الانوار در مختار اور احیاء العلوم جیسی کتابوں کا گذشتہ صدی میں ترجمہ کر دیا۔

(ج) تیسرے درجہ پر دینی تعلیم عربی زبان کے ذریعہ سے ہو۔ دار العلوم دیوبند کا عربی نصاب ہند کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے فقہ و حدیث و تفسیر و فلسفہ و کلام سمجھنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے دینی علوم کا تکمیلی نصاب سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے۔

اس کے بعد میں اس صنف علماء کو مشورہ دیتا ہوں۔ کہ وہ تکمیل علوم دینیہ کے دار التکمیل کھولیں۔ دار العلوم دیوبند میں فقط علم و حدیث کی تعلیم ایک حد تک تحقیقی اور تکمیلی ہوتی رہی ہے۔ باقی فنون درجہ اعدادیہ سے آگے نہیں بڑھے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے اور جمعیۃ الانصار نے اسے قبول کر لیا تھا کہ دار التکمیل میں امام ولی اللہ کی کتابیں پڑھائی جائیں۔

آج میں اس کی تصریح کرنے کے لئے آپ کے سامنے کھڑا ہوا ہوں کہ امام ولی اللہ دہلوی کی حدیث و فقہ میں جس قدر ضرورت ہے۔ اس سے زیادہ ہم ان کی حکمت و فلسفہ و سیاست سمجھنے کے محتاج ہیں۔

میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ یورپ کا فلسفہ سمجھنے کیلئے اور انقلابی سیاست پر قابلیت سے غور کرنے کے لیئے یا اپنی قومی اور مذہبی خودی قائم رکھنے کے لیئے اس امام کی کتابوں کی بیحد ضرورت ہے۔ اس کا جبر کوئی دوسرا مصنف نہیں کر سکتا۔

میں سفارش کرتا ہوں کہ تفسیر میں فتح الرحمٰن اگرچہ فارسی ترجمہ ہی ضرور پڑھایا جائے۔ وہ اس قدر فوائد پر مشتمل ہے کہ کوئی تفسیر اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔

نحوی عالموں نے جس طرح عربی گرامر کا بیجا استعمال کر کے قرآن کو سمجھنے میں تشکیک پیدا کر دی ہے، فتح الرحمٰن اس سے نجات دلاتا ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا اردو کی حفاظت کے لیئے فارسی کی ضرورت ہے۔ یہ ترجمہ اگر داخل درس رہا۔ تو وہ مطلب بھی پورا ہو جائے گا۔

اصول التفسیر میں فوز الکبیر اور علم حدیث کی اصولی و فروعی شرح کرنے میں حجۃ اللہ البالغہ بے نظیر کتابیں ہیں۔ ایسا ہی اہل السنۃ کی فقہ مجتہدانہ سمجھنے میں مسوّی مدد دیتی ہے۔ اس کے بعد ازالۃ الخفاء دور اول کی تاریخ کا فلسفہ اور اصول سیاست سکھلاتا ہے۔ البدور البازغہ نیچرل حکمت سکھاتی ہے۔ اور اس اصول کی تشریح میں بے نظیر کتاب ہے۔ کہ کیوں فطرت انسانیہ ادیان الہیہ کا معیار بنائی گئی۔ الخیر الکثیر فلسفہ الہیات کو کتابی

سنت کی شرح میں استعمال کرنے کے قابل بناتا ہے۔

میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ سب کتابیں دارالعلوم دیوبند جیسے مرکزی مدارس میں داخل درس کردی جائیں

یہاں پہنچ کر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک دو شبہات کا جواب ذکر کردیا جائے۔

پہلا شبہ یہ ہے کہ مصر میں عربی کی تجدید ہورہی ہے تسہیل التعبیر کتابیں تمام فنون کی نئی تصنیف ہورہی ہیں۔ علمائے ہند کو اپنا عربی کورس ان کے تتبع میں تبدیل کرلینا چاہئے۔

میں اس تبدیلی کا مخالف ہوں اور مجھ پر ارتجاعی ہونے کا الزام لگانے سے پہلے میرا جواب سن لینا چاہئے۔

نئی شکل میں اصلاح شدہ عربی مدارس سے جو طالب علم نکل رہے ہیں وہ اپنی تاریخ و فلسفہ سے ناواقف ہوتے جاتے ہیں اور یورپین فلاسفی ان کے اذہان پر غالب ہورہی ہے۔

مثال کیلئے سعودی حکومت کے طلبہ کو لیجئے وہ اعتقاداً شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے متبعین میں سے ہیں۔ اور اسی کی اتباع کی دعوت کو سلفیت کا نام دیتے ہیں مگر جہالت یہ ہے کہ ان میں سے ایک عالم بھی اس کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ کہ وہ شیخ الاسلام کی منہاج السنۃ یا عقل و نقل سمجھ سکتا ہے۔ دوسرے کو سمجھانا تو بہت دور ہے۔

میرا خیال ہے اسی طرح اگر نیا اصلاح شدہ عربی نصاب ہمارے مدارس میں غالب آگیا۔ تو یقین مانئے کہ ہم حجۃ اللہ البالغہ جیسی کتاب سمجھنے سے عاری

ہو جائیں گے۔

ہمارا اپنا فلسفہ جب ذہن سے نکل گیا، تو ہم ہر طرح بہکائے جا سکتے ہیں۔ دوسرا شبہ کہا جاتا ہے۔ کہ کیا ہم یوروپین سائنس اور صنعتیں سیکھنے کے محتاج نہیں ہیں۔ اس لئے ہمیں سہل عربی سے فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔

میرا جواب یہ ہے۔ کہ میں سائنس سیکھنے کا کسی صورت میں انکار نہیں کر سکتا۔ مگر اس کے لئے عربی کو آلہ نہیں بنانا چاہئے۔ بلکہ انگریزی کے ذریعہ سے اس کی تکمیل ضروری ہے۔

عربی لکھنے والوں میں نقل و ترجمہ کے سوا اور کوئی کمال نہیں۔ اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کو نقل در نقل کا عادی نہ بنایا جائے۔

البتہ میں حربی علوم سیکھنے کے لئے ترکی زبان کو تمام یوروپین زبانوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ اس کی گرامر بہت آسان ہے ایک ہندوستانی چار مہینہ میں ایک گھنٹہ روز صرف کر کے اس قابل ہو جاتا ہے کہ کالج کے لکچر سُن سکے۔

ایسا ہی طبی فنون کے لئے بھی ترکی زبان کو ترجیح دیتا ہوں۔ سلاطین عثمانیہ نے حربی و طبی کالج استنبول میں بنا کر تمام مسلمانوں پر بڑا احسان کیا ہے۔

جمعیۃ العلماء کا دوسرا سیکشن اسلامی فلاسفی کا محافظ ہو۔ یہ اسلامی فلاسفی دراصل وہی ہندو فلاسفی ہے۔ جسے مسلم صوفیائے کرام نے ہند میں تکمیل کے درجہ تک پہنچایا ہے۔ ایسا درجۂ تکمیل کا معلم اور مرشد بجز امام ولی اللہ دہلوی کے سوا اور

کوئی نہیں ہو سکتا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے الفاظ عامہ سے ہماری مراد وہ علمار ربانی ہیں جو دوسری ہزار ہجری کے دوران میں ہند میں پیدا ہوئے۔ ہم امام ولی اللہ کو سب سے بڑا اس فن میں امام مانتے ہیں۔

میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ میں دہلی کی جامعہ ملیّہ میں اس امام کی فلاسفی سکھلانے کے لئے ایک مدرسہ بنانا چاہتا ہوں جو میرے استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن کی یادگار ہوگا۔ غالباً جمعیۃ العلمار بنگال اس تحریک کو اچھی نگاہ سے دیکھے گی۔

اس مدرسہ میں امام ولی اللہ کی فلاسفی انگریزی زبان میں ترجمہ کر دی جائیگی۔ اور مسلم وغیر مسلم ہر ایک کو مساوی درجہ پر سکھلائی جائے گی۔

ترکوں نے ترکی مسلمانوں کو نیشنلسٹ بنایا۔ تو اس میں یقیناً ایک درجہ تک لادینی بھی آگئی۔ اگر ہم اسلامی فلاسفی کا اسکول قائم کر سکے تو مسلمانانِ ہند کو نیشنلسٹ بننے میں اسلام چھوڑنا نہیں پڑے گا۔

اور ہندو فلاسفروں سے متحد الخیال ہو کر یوروپین انقلاب معاشی میں وہ مذہب کو بہت آگے لے جائیں گے۔

(۸) جمعیۃ علمائے ہند کا یہ سیکشن جو حکمت و فلسفہ کے لئے خاص ہوگا۔ میں اس کے ہر ایک ممبر کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کا ممبر ہو جائے۔ اور پہلے سیکشن کے ممبروں کو براہِ راست سیاست میں حصّہ نہیں لینا چاہیئے۔

وہ فقط اس دوسری سکشن کے ماتحت رہ کر ان کی تائید کے لئے عوام کو جمع کیا کریں اور اس طرح جمعیۃ العلماء ذہنی انارکزم سے نجات پائے گی۔

(۹) میں مشورہ دیتا ہوں۔ کہ ان فلاسفروں کی ذمہ داری پر ان کی نگرانی میں پہلی قسم کے علماء اور طالب علموں کی ایک جمعیۃ قائم کی جائے۔ جسے خدام خلق کہا جائے۔ وہ ہر ایک انسان کی حاجت روائی کرکے بغیر کسی امتیاز مذہبی کے خدمت کریں۔

اسی خدمت کے زور پر جمعیۃ علماء ہند کی سیاسی عزت قوم میں مسلم رہے گی۔

(۱۰) میں جمعیۃ العلماء کو مشورہ دیتا ہوں۔ کہ اس کے حکیم و فلاسفر اس طرف متوجہ ہوں کہ وہ قرآن عظیم کی حکیمانہ تفسیر مسلم اور غیر مسلم سب کے سامنے پیش کرنا اپنا فرض قرار دیں۔

میں اس کی اطلاع دیتا ہوں۔ کہ امام ولی اللہ کی حکمت کا وہ مدرسہ جس کا جاری کرنا ہم جامعہ ملیہ میں تجویز کر رہے ہیں۔ اس تحریک کو چلائے گا۔ اور اس خدمت کو ادا کرتا رہے گا۔

خطبۂ افتتاح

ٹھٹہ (سندھ) ضلع کانگرس کمیٹی کی کانفرنس منعقدہ
۱۲ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء میں پڑھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر۔ انک علی کل شیٔ قدیر۔

تو رحیم و ملک وبا رہے سلم سلم ہم جہول او زیاں کار ہیں ارحم ارحم

بھائیو اور بہنو! آپ میں سے ہر ایسا مرد اور عورت جو دین دھرم کو مانتا ہے۔ اپنے خالق، اپنے سرجن ہار پر یقین رکھتا ہے۔ ایک منٹ کے لئے ابسے یاد کرے۔ اور اپنی ارادی قوت کو جمع کر کے اس سے دعا مانگے۔ پرارتھنا کرے کہ وہ ہمیں سیدھا راستہ دکھلائے ؎

ذات پات پوچھے نہ کو ہر کو بھجے سو ہر کا ہو:

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

اما بعد! میں کانگریس کمیٹی کے کارکن ممبروں کا تہ دل سے شکریہ ادا

ہوں۔ کہ انہوں نے مجھے اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ اور سب سے پہلے تقریر کرنے کا موقعہ دیا۔ میں تمام حاضرین کو اس شکریہ میں شریک کرنا چاہتا ہوں کہ میری بات سُننے کے لئے جمع ہوئے۔ میں اس یقین کے ساتھ اس کانفرنس کو شروع کرتا ہوں۔ کہ آپ جس نیک مقصد کے لئے اتنی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں اس میں کامیاب ہو کر رہیں گے۔ اگر چند گھڑیوں کی تاخیر ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ مسلسل کام کرنے والوں کی کامیابی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ میرا دل خوشی سے بھرا ہوا ہے۔ کہ سندھ کے ایک تاریخی شہر میں ضلع کانگریس کمیٹی کی کانفرنس کا افتتاح کر رہا ہوں۔ یہ میرے لئے بہت بڑی عزت ہے جو مجھے اپنی بھائیوں بہنوں کی طرف سے حاصل ہوئی۔

اس قدر زیادہ خوشی کے تین اسباب ہیں:۔

(۱) مجھے سندھ سے محبت ہے۔ یہ میرے دینی باپ کا وطن ہے۔ میں نے اسے پچاس سال سے اپنا وطن بنا لیا ہے۔ اس زمین کو سیراب کرنیوالے دریا کی ہماری مذہبی کتابوں میں تقدیس کی گئی ہے۔ میں نے اس کے کنارہ پر بچپن سے پرورش پائی ہے۔

(۲) مجھے اس شہر سے محبت ہے۔ اس میں مقدس علماء اور عارفین کا بڑا مجمع رہا ہے۔ آخری زمانہ میں مخدوم محمد معین کا گھر اسی شہر میں تھا۔ وہ شاہ عبداللطیف کے ہم صحبت بزرگ تھے۔ اور انہوں نے ہمارے امام ولی اللہ دہلوی

سے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح یہ شہر ہماری حکمت کا ابتدا سے معدن ہے۔

(۳) مجھے نیشنل کانگریس سے محبت ہے۔ چونکہ دنیا کی نظر میں وہ ہمارے ملک کی معزز سیاسی مجلس ہے۔ میں سولہ سترہ برس کانگریس میں کام کرتا رہا ہوں۔ اس کا خادم ہونے کے نام سے مجھے بہت فائدے پہنچے ہیں۔ میں اس سیاست کا مطالعہ کر سکا۔ جس کے بعد مجھے امام ولی اللہ کی حکمت اور قرآن مجید سمجھنے میں آسانی ہوئی۔

میں مدت سے تمنا کرتا رہا ہوں۔ کہ اس قسم کے اجتماع میں شرکت نصیب ہو۔ جب ایک طرح کی مایوسی کے بعد خواہش پوری ہوتی ہے۔ تو اس خوشی کا ہر ایک شخص اندازہ نہیں کر سکتا۔

حضرات! عموماً سیاسی مجالس اس قسم کی عزت انہی لوگوں کو دیتی ہے۔ جن سے ان کی قوت میں اضافہ ہو۔ میں اس امر کو صفائی سے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں اس وقت اس پوزیشن میں نہیں۔ کہ میرے ساتھ بہت سے لوگ کانگریس کے ممبر بن جائیں۔ یا میری وجہ سے کانگریس کمیٹی کو مالی مدد ملے۔ میں اسوقت یہی کر سکتا ہوں کہ اپنا سیاسی مطالعہ آپ کے سامنے پیش کر دوں۔

مجھے یہ بھی آپ کی خدمت میں عرض کر دینا چاہئے۔ کہ میں ہر دلعزیز بننے کی بھی کوشش نہیں کرتا۔ میں اب تک کانگریس کا پرائمری ممبر بھی نہیں بنا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے مشورے آزادی سے سنا سکوں۔ کسی اصطلاحی قانون

کی پابندی نہ کرنے سے میں کانگریس سے علیحدہ نہیں ہوسکتا۔ میں نیشنل کانگریس ہوں۔ نیشنل کانگریس میری ہے۔

البتہ وہ پارٹی پروگرام کامیابی سے چلا۔ جو ہم نے جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی کے نام سے شائع کیا ہے۔ تو ہم کانگریس تحریک کو بہت آگے لے جائیں گے۔

آپ کی اجازت سے ہم اپنے مطالعہ کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ آخر میں بتلائیں گے کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے مطالعہ کا پہلا حصہ وہ ہے۔ جو ہم نے ہندوستان چھوڑنے سے پہلے حاصل کیا۔ میں پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوا۔ اور بچپن میں دریائے سندھ کے کنارے جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں میں پرورش پائی۔ یہیں میں نے اسلام کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ اسلام میں نے ایک پنڈت سے سیکھا۔ ہمارے ملک میں برطانوی قبضہ کے بعد دو دفعہ ہندو سوسائٹی کی اصلاح شروع ہوئی۔ دونوں میں اس قدر فرق ہے۔ جیسے ایکسٹریمسٹ اور ماڈریٹ میں ہوتا ہے۔

پہلی دفعہ پنڈت اننت رام نے پرانوں کی شرک آمیز تعلیم کا اسلامی توحید سے مقابلہ کیا۔ اور آخر میں خود مسلمان ہوگیا۔ وہ مسلمانوں میں پنڈت مولوی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تحریک پنجاب میں خوب پھیلی۔ سینکڑوں ہندو

نوجوان مسلمان ہو گئے۔ میں سولہ برس کی عمر میں ۱۸۸۷ء کو اسکی کتاب "تحفۃ الہند" کو بار بار پڑھنے سے اسلام لایا۔ میں نے اپنا نام عبید اللہ پنڈت مولوی کے نام پر خود رکھا ہے۔ میں نے اپنے ہم جماعت طالب علموں سے نماز پڑھنی سیکھ لی۔ اس زمانہ میں جب میں گھر پر تنہائی میں نماز پڑھتا۔ تو اس قدر سرور حاصل ہوتا جو اب تک باوجود اس قدر علم پڑھنے کے اور عمر گذارنے کے کبھی کبھی وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس تحریک کو انتہا پسند سمجھنا چاہئے۔

دوسری تحریک پنڈت دیانند سرستی کی ہے۔ وہ آریہ سماج کے لئے مرکز تلاش کرنے میں ملک ملک پھرے۔ مگر اس کا پنجاب کے سوا کہیں اچھا استقبال نہیں ہوا۔ پنجاب کی ہندو سوسائٹی پنڈت مولوی کی تحریک کے لئے آریہ سماج کی تائید میں پوری متوجہ ہو گئی۔ پنڈت مولوی کا یہ کمال تو دشمن بھی مانتے ہیں کہ پرانک شرک سے ہندو سوسائٹی کو اس نے بچایا۔ آریہ سماج نے بھی اسی کی ہمزبانی اختیار کی۔ ہم اسے اعتدال پسند کہتے ہیں۔

یہاں آپ کو ایک حکایت سناتا ہوں۔ جس سے دونوں تحریکوں کی اساسی وحدت آپ کو نظر آنے لگے۔

جب میں استانبول میں تھا۔ میرے ایک معمولی ڈاک سے سادہ خط لکھنے پر لالہ لاجپت رائے مجھ سے ملنے کے لئے وہاں پہنچے۔ انہوں نے استانبول پہنچنے کے لئے کیا کیا ڈپلومیٹک تدبیریں اختیار کیں، میں ان سے

بحث نہیں کرتا۔

ایک دن بر سبیل تذکرہ میں نے کہا۔ کہ میری والدہ ایک دن رو رہی تھی۔ کہ میری موت کے بعد گائے بخشنے والا کوئی نہیں رہا۔ میں نے اسے کہا کہ تو خود برہمن کو گائے دیدے۔ وہ حیران ہو کر کہنے لگی۔ تو مجھے گائے لا کر دے سکتا ہے۔ میں اس کے لئے گائے خرید لایا۔ اور وہ برہمن کو دے آئی۔ تو خوش ہو گئی

لالہ جی نے کہا۔ جب میں آریہ سماج میں داخل ہوا۔ تو میری والدہ بھی اسی خیال سے رونے لگی۔ اور میں نے بھی یہی علاج کیا۔ جس سے وہ خوش ہو گئی

میں اسلام لانے کے بعد مدرسہ دیوبند میں داخل ہوا۔ میرے دینی استاذ مولانا محمود حسن دیوبندی شیخ الہند ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہو کر میں اپنے استاد کی سیاسی تحریک میں شامل ہو گیا۔

دیوبندی سیاسی تحریک

یہاں دیوبند کی سیاسی تحریک سمجھنے کے لئے چند کلمات لکھنے کی اجازت دیجئے۔

دہلی کے مسلمان لیڈر ۱۸۵۷ء کے بعد دو سیاسی جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ کواپریٹر۔ نان کواپریٹر۔ پہلی جماعت کے لیڈر سر سید احمد خاں ہیں۔ علیگڈھ یونیورسٹی ان کی مرکزی تعلیم گاہ ہے۔ دوسری جماعت کے پیشوا مولانا محمد قاسم دیوبندی ہیں۔ دار العلوم دیوبند ان کا علمی اور سیاسی مرکز رہا ہے۔ دیوبندی اسکول ہند کو کیا سمجھتا ہے۔ اس کے لئے سبحۃ المرجان عربی تاریخ ہند پڑھنی

چاہئے۔ قدیم مذاہب ہند کے متعلق ان کے نظریات مرزا مظہر جانجاناں اور امام عبدالعزیز دہلوی کے مکتوبات میں ملیں گے۔

میں ان کی ترجمانی مختصر الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔ ہمارا ہندوستان دنیا کی تاریخ میں عظیم الشان رفعت کا مالک ہے۔ پہلے دور میں اس نے سنسکرت جیسی زبان پیدا کی۔ کلیلہ دمنہ جیسی حکمت کی کتاب لکھی۔ فوجی تمرین کا کھیل شطرنج ایجاد کیا۔ ریاضی میں یونان کا ہمسر بنا۔ الٰہیات میں ویدانت فلاسفی سکھانے میں جگت گرد بنا۔ اس سے ویدک دھرم اور بودھ دھرم دنیا میں پھیلے۔ اس نے مہاراجہ اشوک جیسے حکمراں پیدا کئے۔ دوسرے دور میں قدیم انسانیت کی علمبردار سوسائٹی کو اسلام جیسے انٹرنیشنل پروگرام سے آشنا کرنے والا جلال الدین اکبر پیدا کیا۔ اس نے مشرقی ایشیا کی زبانوں کو ملا کر اردو جیسی انٹرنیشنل زبان پیدا کی۔ جس نے محی الدین عالمگیر جیسا سلطان پیدا کیا۔ جو تمام ممالک ہند کو ایک قانون کا پابند بنانا سکھا گیا۔ جس نے امام ولی اللہ جیسا فلاسفر پیدا کیا۔

تاریخ کے دونوں زمانوں میں ہمارے ملک کی اس طرح ہتک نہیں ہوسکی۔ کہ کوئی قوم باہر بیٹھ کر ہم پر حکومت کرے۔ لیکن جب سے دہلی پر برطانوی قبضہ ہوا۔ ہمارے ملک کے نورانی چہرہ پر غلامی کا سیاہ داغ لگ گیا۔

دیوبندی اسکول کا نصب العین یہ ہے۔ کہ اس دھبہ کو دور کرنے کی

جد و جہد میں مصروف رہا ہے۔ یہ اسکول اب تک تین دفعہ اپنے پروگرام میں مناسب وقت تبدیلی کر چکا ہے۔ یورپ کی آج کی سائنٹفک اصطلاح میں اس سیاسی گروپ کو ایک سیاسی پارٹی نہ کہا جائے۔ تو ہم اسے تسلیم کرتے ہیں مگر ملک میں اس کی قوت اور طاقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خلافت تحریک میں اس کا مظاہرہ ہو چکا ہے۔

دیوبندی لیڈر

لوگوں کو شاید معلوم نہ ہو کہ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بھی میرے استاد کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا محمد علی کو ڈاکٹر انصاری نے شیخ الہند سے ملایا۔ اس کے بعد شیخ الہند نے اپنی جماعت کو مولانا محمد علی کے تابع کر دیا۔ اس دن سے مولانا محمد علی مسلمانان ہند کے واحد لیڈر بنے۔ اور دہلی کے دونوں اسکول مل کر ایک ہو گئے۔ اس متحدہ طاقت نے نیشنل کانگریس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کے ماند مرکزی فکر اسی نان کواپریٹر دیوبندی اسکول کا غالب رہا۔

اس مجمع میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت مستقل حیثیت رکھتی تھی۔ جو حکیم اجمل خاں کے ساتھ مٹی ہوئی دہلی کا ایک نشان تھے۔

لوگوں کو شاید یہ بھی معلوم نہ ہو۔ کہ مولانا شیخ الہند کا سندھ میں کس قدر اثر تھا۔ میرے مرشدوں کے سلسلہ میں مولانا تاج محمد امروٹی اور حضرت

پیر صاحب العلم پیر رشد اللہ شاہ اور کراچی کے مدرسہ مظہر العلوم اور گوٹھ پیر جھنڈا کے مدرسہ دار الرشاد کے متعلق علماء کی جماعتیں سب دیوبندی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔

مولانا محمد صادق رئیس جمعیۃ علماء سندھ اور ان کے بھائی شیخ محمد ابراہیم ایم۔ اے دیوبندی اسکول کے خاص کارکن رہے ہیں۔

نان کواپریشن اور دیوبند

لوگوں کو حیرت ہوگی کہ نان کواپریشن کی تحریک جو خلافت کے زمانے میں کانگریس نے قبول کی ہے۔ وہ مدرسہ دار الرشاد کے ایک دیوبندی استاذ مولانا نور الحق کی تجویز تھی۔ مولانا نور الحق جناب پیر صاحب العلم کے ایک سیکریٹری تھے۔

میں ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۷ء سے اس دیوبندی اسکول کا سیاسی کام کرتا ہوں ۱۹۱۵ء میں مجھے شیخ الہند نے کابل جانے کا حکم دیا۔ جہاں میں آزادی پسند ہندو دوستوں سے مل کر ہندوستانی کام کرتا رہا۔ برٹش امپائر سے باہر سب سے پہلی کانگریس کمیٹی کابل میں نے قائم کی۔ گیا سیشن میں اس کا الحاق کانگریس نے قبول کرلیا۔ کابل کانگریس کمیٹی کو دیوبندی اسکول چلاتا رہا ہے۔

داخلی امور میں مولانا کفایت اللہ جیسا عقلمند عالم اور مولانا حسین احمد جیسا ثابت قدم مسلسل کام کرتے رہے ہیں۔ یہ سب مولانا شیخ الہند کے خادم ہیں۔

اپنی تعلیم اور اپنے سیاسی مسلک سمجھانے کے بعد اب ہم اپنے مطالعہ کا دوسرا حصہ شروع کرتے ہیں۔ یعنی بائیس برس باہر رہ کر ہندوستان اور یورپ سے کیا کچھ سیکھ سکے۔

ہم نے مہاتما جی سے نان وائیلنس سیکھا۔ ہم پنڈت موتی لال نہرو کو شمالی ہند اور لوکمانیہ تلک مہاراج کو دکن میں نیشنل کانگریس کا مستقل رہنما مانتے ہیں۔

یورپ میں دو تحریکیں کارفرما ہیں۔ لبرل ازم اور راڈیکل ازم۔ پہلی تحریک کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ یورپ کے اکثر ممالک جمہوریہ بن گئے۔ حکومت بادشاہ کے نام سے ہو۔ یا منتخب رئیس کے نام سے۔ بہر دو صورت ملک کے اہل آراء پارلیمنٹ کے مشورہ سے کام ہو رہا ہے۔ اس طرز حکومت میں برطانیہ یورپ کے لئے استاد کا کام کرتا رہا ہے۔

دوسری تحریک کے متعلق ذرا وضاحت سے بیان کی ضرورت ہے پچھلی صدی سے یورپ تنہا ہمارے ملک سے نہیں بلکہ اکثر مشرقی ممالک سے بہت زیادہ ترقی کر چکا ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ یہ ترقی مذہب یا تہذیب کی نہیں ہوئی۔ دیکھئے ہمارا ملک آج تک باوجود ہزارہا کوششوں کے اس مغالطہ میں ہار نہیں مانتا۔ یورپ کی یہ ترقی دراصل راڈیکل ازم میں ہے۔ یوروپین اقوام نے چھوٹے بڑے کام کے لئے اس قدر مشینیں بنائی

ہیں کہ مشرقی ممالک اس کے مقابلہ سے عاجز آگئے۔

ظاہر ہے کہ یہ مشینیں کاریگروں کے سوا کام نہیں کرتیں۔ ان کاریگروں کو یورپ میں مزدور کہا جاتا ہے۔ آپ انھیں اپنے ملک کے ناتربیت یافتہ مزدور نہ سمجھ لیجئے گا۔ اس مزدور جماعت کا ایک نمائندہ برٹش ایمپائر کا پرائم منسٹر رہ چکا ہے۔

مشین کا خاصہ ہے کہ وہ تمام کاریگروں کو منظم کر دیتی ہے۔ ایک مشین کے ساتھ کام کرنے والے مزدوروں کی جماعت جب تک ایسی متحد نہ ہو جائے گویا وہ ایک فرد واحد ہے، اس وقت تک کسی کاریگر کو روٹی کا ٹکڑا نصیب نہیں ہوتا۔

حضرات! آپ جانتے ہیں کہ ایک صدی سے ہمارے ملک پر برطانیہ حکومت کر رہا ہے۔ اس نے اپنا قبضہ جمانے کے لئے جو کام کئے اس وقت تھوڑی دیر کے لئے ان سے قطع تعلق کر لیجئے لیکن جب اس نے ملک پر اپنی حکومت قائم کر لی تو اس نے ہمیں جمہوریت سکھلانا شروع کر دیا۔ اس کی بنائی ہوئی یونیورسٹیوں نے ہمارے نوجوانوں کو جمہوریت پسند بنا دیا۔ ہمارے ملک میں اسمبلی اور کونسل اسی جمہوریت پسند عناصر کو راضی کرنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اب ہندوستانی راجہ اور نواب کی حکومت بھی اپنے ملک کی مشیر پارلیمنٹ کے سوا نہیں چل

سکتی ۔ یہ سب اسی جمہوریت پسندی کی برکت ہے۔

جیسے برطانیہ نے ہمیں لبرل ازم سکھلایا۔ اسی طرح انہوں نے ہمارے ملک کو مشین سے بھی آشنا کر دیا ہے۔ مشین کا سب سے بڑا کارخانہ ہمارے ملک میں ریلوے کا جال ہے، جو تمام اطراف میں بچھا دیا گیا ہے۔ اس نے ہمارے ملک میں بھی مشین سے کام کرنے والی جماعتیں پیدا کر دی ہیں۔

ہمارے نوجوان اگر دنیا کی قوموں کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں۔ تو انہیں اس معاملہ میں برطانیہ کا شکر گذار ہونا چاہئیے۔ ہم نے اپنی سیاحت میں دیکھا کہ ترک، ایرانی افغانی اور عرب اپنے ممالک میں جمہوریت اور مشین کو ترقی دے رہے ہیں۔ ہمارا ہندوستان اس معاملہ میں ان سے بہت آگے ہے۔

یہ یورپ کی ترقی کا روشن پہلو تھا۔ اب اس کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ کیجئے۔

اس ترقی یافتہ یورپ کو ہم ایک مصیبت میں مبتلا دیکھتے ہیں۔ یورپ کی جس قدر قومیں جمہوریت پسند ہیں۔ اور مشین کے استعمال سے دنیا پر برتری حاصل کر چکی ہیں۔ اگر ان کی پارلیمنٹ میں محافظین اور لبرل کی اکثریت ہے۔ تو ان قوموں کو ایک خطرناک انقلاب ڈرا رہا ہے۔ ان کی پارلیمنٹ میں، کاریگروں کا غلبہ ہو کر رہے گا۔ چونکہ یہ کاریگر اور

مزدور ایک طویل زمانہ سے کنزرویٹیو اور لبرل کے ظلم کا شکار ہوتے رہے ہیں اس لئے ان سے انتقام کا جذبہ مزدوروں میں پیدا ہونا ضروری ہے۔
یہ بھی یاد رہے کہ جن ملکوں میں مشین پر کام کرنے والے انقلاب پیدا کریں گے۔ اس وقت اگر ملک کے کاشتکار بھی منظم ہو چکے ہوں۔ تو وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔

اس لئے اس قسم کے انقلاب کا اثر پہلے درجے پر تو نہیں البتہ دوسرے یا تیسرے درجہ پر ہمارے ملک میں بھی آئے گا۔ اگرچہ ہم اس انقلاب کے ضمن میں آج پہلی صف میں کھڑے نہیں ہو سکتے۔ مگر دوسرے یا تیسرے دن ہم پر سب کچھ عائد ہو سکتا ہے۔ جو یورپ کی جمہوریت پسند قوم پر آج وارد ہوگا۔

اس قدر جان لینے کے بعد ہماری رائے میں اب کوئی تذبذب نہیں رہا۔ ہم "مکینکل ازم" کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ ورنہ مالی ترقی سے ہمارا ملک محروم ہوگا اور وہ دوسروں کا اچھوت غلام بن کر رہ جائے گا، البتہ یوروپین قوموں کے لئے جو مصیبت آ رہی ہے اس سے ہم کسی قدر مامون ہیں۔

لیکن ایک ایسے انسان کے لئے جو مذہبی جماعتوں کی نمائندگی کرتا ہے، یہی مصیبت ایک اور راستہ سے آتی ہے۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ مذہبی قانون تو الگ رہا۔ سرے سے خدا کا انکار بھی عام طور پر

ضروری ہوگیا ہے۔ میں چونکہ مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا اسلئے اس مشکل کا علاج برابر سوچتا رہا ہوں۔ مجھے اس سلسلہ میں مسئلہ وحدت الوجود کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ملا جس سے کہ ایک سائنس دان کو خدا کے وجود کا یقین دلایا جا سکے۔

چونکہ یہ مسئلہ ہندو فلاسفی کا بھی اصل اصول ہے۔ ویسے ہی امام ولی اللہ اسی کو مان کر حکمت اور فلسفہ کا ایسا اسکول قائم کرتے ہیں جس سے تمام مذاہب اپنی تشنگی رفع کر سکتے ہیں۔ اسلئے میری مستقل رائے یہ ہے کہ

(۱) مادی ترقی کے لئے ہمیں یورپ کے برل ازم اور مکینکل ازم دونوں کو بخوشی قبول کر لینا چاہیئے۔ جیسے ترکی وغیرہ ممالک میں ہو رہا ہے۔ میں اس مجموعہ کو یوروپین ازم کہتا ہوں۔ جیسے کہ کمال پاشا نے اپنی دیہاتیوں کو استنبولیوں کے برابر بنا دیا۔ میں اسی طرح اپنے کاشتکاروں کو علی گڑھ سوسائٹی کے اعلیٰ درجہ پر لانا چاہتا ہوں۔

جب امیروں کی اولاد نے یوروپین ازم سیکھا۔ تو گھر بیچ کر یورپ سے عیاشی کا سامان خرید لائے۔ نہ انہوں نے علم سیکھا نہ فن جس سے قوم میں ترقی پیدا ہوتی۔ ادنیٰ طبقہ اگر یوروپین معاشرت اختیار کرے گا تو زیادہ کمائے گا۔ اور اپنی کمائی خود کھائے گا۔ اگرچہ اعلیٰ طبقہ کو یہ امر ناپسند ہوگا۔ مگر اس انقلابی دور میں انھیں سب کچھ مان لینا چاہیئے۔

(۲) روحانی یا مذہبی حفاظت کیلئے امام ولی اللہ کی فلاسفی پڑھانی چاہتے ہیں۔

جسقدر ہندو ویدانت فلاسفی مانتے ہیں انکو چند منٹ میں ولی اللہ فلاسفی سکھلائی جاسکتی ہے۔

ہمارے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ سندھ ساگر پارٹی پروگرام میں ہم نے ان دونوں امور کو اساسی اصول میں داخل کر دیا ہے۔ اب یہاں سے میں اپنے مطالعہ کا تیسرا حصہ شروع کرتا ہوں۔

ہند میں واپس آنے کے بعد ہم نے کیا سمجھا ہے۔ اسے چار نمبروں میں علیحدہ علیحدہ تبلاتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلے ہم پر یہ تلخ حقیقت منکشف ہوئی کہ مسلمانوں کے دیوبندی علی گڑھی دونوں اسکول آپس میں لڑ رہے ہیں۔

ایسا کیوں ہوا۔ آپ کی اجازت سے پہلے تمہیدی طور پر نیشنل کانگریس کے بعض تاریخی واقعات یاد دلاتا ہوں۔ اس کے بعد سب افتراق کو واضح کر دوں گا۔

کانگریس میں انقلابی تحریک دو دفعہ جاری کی گئی ہے۔ پہلی دفعہ تقسیم بنگال کی تنسیخ کے لئے۔ اس کا مرکز کلکتہ کا نوجوان بنگالی تھا۔ یعنی کام کرنے والے اپنے ملک کے لئے کام کرتے تھے۔ وہ ایجی ٹیشن بنگال کی فتح یابی پر ختم ہوا۔ اس کے بعد حالات معمولی رفتار سے چلتے رہے۔

دوسری دفعہ احیائے خلافت کے لئے۔ اس ایجی ٹیشن کا مرکز دہلی کا مسلمان ہے۔ جو دیوبند اور علی گڑھ کے اتحاد اور اتصال سے

پیدا ہوا تھا۔ یہ تحریک ناکامی پر ختم ہوئی۔

اس کا اصل سبب اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کے سوا اور کوئی وجہ دکھائی نہیں دے گی کہ کام کرنے والے دوسرے ملک کے لئے کام کر رہے تھے۔ اس دوسرے ملک میں انقلاب آیا۔ پُرانا تُرک شکست کھا کر ختم ہو چکا تھا نئے ترک کے لئے نئی زندگی کے ساتھ خلافت کا سنبھالنا ناممکن تھا۔ اس نے خلافت کو منسوخ کر کے اپنی قومی حکومت یورپین نمونے پر بنائی اور اپنے گھر کی ترقی میں منہمک ہو گیا۔ خلافت منسوخ ہونے پر ہندوستانی مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔

ہندو مسلم سمجھوتہ میں پہلے ایک غلطی رہ گئی تھی جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس میں سے کچھ حصہ لے کر اقلیت کے صوبوں کو عموماً اور یوپی کی اقلیت کو خصوصاً زیادہ حق دیا گیا تھا۔ اس طرح مسلمان ہر حصۂ ہندوستان میں اقلیت بن کر رہ گیا۔ جیسے وہ سارے ہند کی مجموعی آبادی میں باوجود دس کروڑ ہونے کے اقلیت میں شمار ہوتا ہے۔

خلافت کی کامیابی کی امید پر وہ اس وقت تو راضی ہو گیا۔ لیکن جب خلافت تحریک ٹوٹ گئی۔ تو ہر ایک مسلمان اس سمجھوتہ پر نظر ثانی کرانے کی ضرورت محسوس کرنے لگا۔

اس مقصد کے لئے کونسلی و اسمبلی میں جانا چاہئے تھا۔ علی گڑھ پارٹی

نئے طرز پر منظم تھی۔ وہ تھوڑی دُور پیچھے جا کر مسلم لیگ میں داخل ہو گئی۔ اور ہندو اکثریت کے خلاف محاذ بنانے میں کامیاب ہو گئی۔

دیوبند کی پُرانی مذہبی تنظیم پر بھی اسی دیوبندی جماعت کے ارتجاعی لوگ غالب آ گئے۔ اور مسلم لیگ سے مل گئے۔ اس طرح عوام مسلمانوں کو کانگریس سے کوئی تعلق نہ رہا۔ فقط دیوبند کا ترقی کن عنصر جمعیۃ العلماء یا احرار میں بڑھ رہا ہے۔ اور کچھ لبرل مسلمان بھی کانگریس میں نیشنل پروگرام کے حامی ہیں۔

لہ میں اپنے دیوبندی گروپ کو اس ارتجاعی جماعت کے پنجہ سے نکال کر اپنے استاد مولانا شیخ الہند کے مقصد کو نصب العین کا درجہ دے کر آج کل کے پولیٹیکل سائنس کے اصول پر پارٹی کی شکل میں تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔ انڈین نیشنل کانگریس سے باہر رہ کر میرے لئے اس پروگرام کی تکمیل ناممکن ہے۔ اس لئے میں نے مکہ معظمہ سے لکھا تھا کہ میں ہمیشہ انڈین نیشنل کانگریس میں رہوں گا۔ مگر موجودہ پارٹیوں میں شامل نہیں ہو سکتا۔ جب مجھے مناسب ہو گا، اپنی مستقل پارٹی بنا کر کام کروں گا۔ اب میں نے اس پارٹی کا پروگرام شروع کر دیا ہے۔
اللہ ہو الموفق

عبید اللہ

(۲) مسلمانوں کی اس تفریق کو نیشنل کانگریس کے طرز عمل نے کم کرنے کی بجائے اور بڑھا دیا۔ آپ اگر اجازت دیں تو اسے ذرا واضح کردوں۔

جب خلافت ٹوٹ گئی۔ تو کانگریسی رہنماؤں نے اپنی ڈپلومیٹک عقلمندی سے بالتدریج کانگریس کو سوراج کیلئے مخصوص کردیا لیکن اسکے ساتھ یہ بھی ہوا کہ ان پر خلافت تحریک یا مسلمانوں کی نیشنل خدمات کا اتنا اثر بھی نہ رہا کہ وہ مسلمان کو ہندوستانی وطنیت میں اس کی تعداد کے موافق ہی انصاف سے حق دیتے یا دینے پر تیار رہتے۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، وہاں اگر کانگریس ہندوؤں کو جارحانہ پیش قدمی سے روک سکتی۔ تو معاملہ اتنا نہ بگڑتا۔

کانگریس کے تیز گام اور فلاسفر لیڈروں نے انٹرنیشنل ازم کو سامنے رکھ کر ہندوستانی مسلمانوں کے معاملہ میں نیشنل انصاف سے تغافل برتا۔ اس طرح ہندوازم کی جارحانہ اکثریت کیلئے انہوں نے کانگریس کا نام استعمال کردیا۔ اس حرکت نے معاملہ کو بد سے بدتر بنا دیا۔ یہاں تک کہ جمعیۃ العلماء اور احرار کے دیوبندی لیڈر بھی عوام کے سامنے کانگریس کا نام آج نہیں لے سکتے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو شروع سے اس ایجی ٹیشن میں کانگریس کے عام نیشنلسٹ لیڈروں کے ساتھ خلافت اور سوراج

کے لئے شریک ہوئی تھی لیکن آج وہ بغیر کسی خاص پروگرام کے سردار پٹیل کی ڈکٹیٹر شپ کے نیچے روندے جارہے ہیں۔

(۳) اس کے بعد دوسری حقیقت اس سے بھی زیادہ تلخ منکشف ہوئی اجازت دیجئے۔ کہ اس کی تفصیل سناؤں۔

انڈین نیشنل کانگریس کی ترقی حقیقت میں لبرل کے دل و دماغ کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے اجلاس سورت سے کانگریس میں انقلابی آئے اور خلافت ایجی ٹیشن کے ابتدا میں مہاتما جی نے انقلابیوں کے لئے لبرلوں کو کانگریس سے نکال دیا۔ ہمارے خیال میں اب اس انقلابی میں کانگریس کو سنبھالنے کی طاقت نظر نہیں آتی۔ اور لبرل ہی ایک خاص رنگ میں انقلابی فلسفہ کا لبادہ پہن کر اس پر چھا گئے ہیں۔ چرخہ اور کھدر اور سردار پٹیل کی مختاریت اسکو اب آگے نہیں بڑھا سکتی۔ ڈر ہے کہ بنگال علیحدہ نہ ہو جائے۔

اس وقت کانگریس کو مہاتما جی کی تاریخی عظمت اور پنڈت جی کی آگے بڑھنے سے نہ رکنے والی ہمت اتفاقاً مل گئی ہیں۔ اور اسی طاقت سے کانگریس سانس لے رہی ہے۔

میرے لئے یہ نہایت مہیب انکشاف ہے کہ مسلم لیگ کی کانگریس سے لڑائی بھی درحقیقت ایک لبرل لیڈر کے انتقامی جذبہ کا مظاہرہ ہے۔

(۴) یورپ کی جنگ پر اگرچہ ابھی چند ہفتے گذرے ہیں۔ لیکن ہم اس کے متعلق باہر رہ کر بہت کچھ سنتے جانتے رہے ہیں۔ ہماری مستحکم رائے ہے۔ کہ ہمیں اس وقت برطانیہ کی بلا شرط امداد کرنی چاہیئے۔ میں برطانیہ سے لڑنے والی طاقتوں کے ساتھ شریک رہ چکا ہوں اسوقت مذہبی نقطۂ نظر سے میں اسے اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ہم اس جنگ میں شکست کھا گئے۔ مگر اپنے مذہبی فیصلہ کی صحت کا اب بھی یقین رکھتے ہیں۔

لیکن آج حالات مختلف ہیں۔ برطانیہ کی مسلمانوں سے کوئی مذہبی جنگ نہیں۔ ہم اپنے سیاسی مطالعہ کے موافق اپنے ملک کے لئے برطانیہ سے اسوقت پرخاش غلط سمجھتے ہیں۔

اس ایجی ٹیشن کا مطلب دوسری قومیں صحیح نہیں سمجھ سکتیں۔ ہمیں عدم تشدد کی پابندی سے ترقی کا جو موقع برٹش کامن ویلتھ میں رہ کر مل سکتا ہے۔ دوسری صورت میں نظر نہیں آتا۔

حضرات! میرے مطالعہ کے تینوں حصے کچھ مجمل کچھ مفصل آپ کے سامنے آ گئے۔ اب میں آئندہ کے متعلق اپنے ارادے آپ کو سناتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ میں نے نیشنل کانگریس کے اندر ایک نئی پارٹی کا اساسی نظام شائع کیا ہے۔ وہ سندھی۔ اردو اور انگریزی میں چھپ

چکا ہے۔ بہتر ہوگا۔ کہ آپ اُسے پڑھیں۔ اس میں جس قدر بے انصافی کسی ہندوستانی سے کیجاسکتی ہے۔ خواہ وہ مسلمان ہو یا انیگلو انڈین۔ یعنی ہر وہ شخص جس نے ہند میں مستقل رہائش کا فیصلہ کر لیا ہو۔ اس کے معاملات میں بے انصافی کے انسداد کی کوشش کی گئی ہے۔

مسلمانوں کو اپنی اکثریت کے صوبوں میں مطمئن کرنا نیشنل کانگریس کا فرض تھا۔ اور فرض ہے۔

انٹرنیشنل ازم اور فلاسفی کے خاص اصول اور اتحاد زبان کے موٹے موٹے ناموں سے اسے پریشان کیا جاتا ہے۔ ہماری پارٹی کے پروگرام میں اس کی پوری مدافعت ہے۔

اس طرح ہر ایک سنجیدہ سمجھ دار مسلمان کو مطمئن کر کے ہم نیشنل کانگریس میں لے آئیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کام بہت پہلے ہونا چاہئے تھا ؂
ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

آج کیا ہوگا

اسوقت میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کانگریس کے اندر رہ کر میں کیا کام پہلے کرنا چاہتا ہوں اور نوجوانوں سے کس امداد کا طالب ہوں۔ اس کو بھی میں تین مرکزوں کے متعلق علیحدہ علیحدہ ذکر کر دیتا ہوں۔

میری پارٹی کا پہلا مرکز کراچی ہے۔ یہاں سے میں چاہتا ہوں کہ ہر ایک سندھی کو لکھنا پڑھنا سکھلاؤں۔ اسے نیشنل تعلیم دے کر اپنے ووٹ کو صحیح استعمال کرنے کا طریقہ تبلاؤں۔ یہ میرا پہلا قدم ہے۔

میرا پروگرام مستقل ہے۔ جسے میں سات سال میں ختم کر سکتا ہوں موجودہ ریفارم اسکیم کو میں بہت بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔ اگر ہم ملک کی عام آبادی کو اسکے ذریعہ سے فائدہ حاصل کرنے کی سمجھ بوجھ دے سکیں۔

میری استدعا ہے کہ ہر ایک سندھی مجھ پر اعتماد کرے۔ میں انہیں دھوکا نہیں دونگا۔ وہ مجھے اس سات سال کے پروگرام کا تجربہ کرنے میں مدد دے۔ حکومت کسی پارٹی کی ہو میں اس سے کوآپریٹ کروں گا۔ میں الیکشن کی لڑائی نہیں لڑوں گا۔

اس قسم کا کام ذمہ داری سے پورا کرنے میں ایک دفعہ امتحان دے چکا ہوں۔ میں نے کابل میں سات سال مستقل پروگرام پر کام کیا ہے۔ امیر بدل گئے، نئے وزیر آئے۔ انقلاب آیا۔ مگر میرے پروگرام کو بدلنے کا کسی کو خیال تک نہیں آیا۔ کابل میں شاہی حکومت کے اندر ہندوستانی نیشنل کام سات سال تک جاری رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ میں اگرچہ ضعیف ہوں۔ بوڑھا ہوں۔ مگر میں اپنا کام بفضلہ تعالیٰ بہت جلد نوجوانوں کو سکھا دوں گا۔

حضرات! اس کام کو شروع کرنے کی تدبیریں کر رہا تھا کہ سکھر کا واقعہ پیش آیا۔ اگر میں اس کی اصلاح میں حصہ نہیں لیتا تو میں اپنا پروگرام جاری نہیں کر سکوں گا۔ اسلئے میں نے دارالرشاد کے مرکز سے ۹ جنوری کو ضلع حیدرآباد کے دیہات میں والنٹیر بھیجنے شروع کر دیئے جو گاؤں کی عام آبادی کو جمع کر کے ان کو آمادہ کریں گے کہ وہ اس گاؤں کے رہنے والوں ہندوؤں کو اپنا بھائی سمجھ کر ان کی حفاظت اسی طرح کریں گے، جیسے ہم اپنے اور عزیزوں کی کرتے ہیں۔ میں انتظام کرونگا کہ اس اقرار کے تین کاغذ لکھے جائیں۔ ان پر اس گاؤں کے سرکردہ لوگوں کے دستخط ہوں۔ ایک کاغذ میری پارٹی کے دفتر میں رہے گا۔ دوسری نقل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس بھیجیں گے۔ تیسرا کاغذ کانگریس کے دفتر میں جائے گا۔ میں نے ۱۰ر جنوری کے ہندو میں پروفیسر نارائن داس کی تجویزیں پڑھی ہیں۔ غالباً یہ وہی پروفیسر ہیں۔ جن سے ہم دہلی میں ملے تھے یقین ہے کہ ہمیں ضرور کامیابی ہوگی۔

ہجرت اگر میری آواز مہاتماجی تک پہنچتی ہے تو میں ان سے التجا کرونگا کہ وہ کسی سندھی کو ہجرت کا مشورہ نہ دیں۔ میں ہجرت کا تجربہ اپنی ذات پر کر چکا ہوں۔ میں ہندوستانی مہاجروں کی کابل میں اور بلگیریا اور سردیا کے ترک مہاجروں کی استنبول میں پریشانی دیکھ چکا ہوں۔ مہاتماجی نے میرے خیال میں اس لفظ ہجرت کا پس منظر خواب

میں بھی نہیں دیکھا۔ میں سندھی ہوں۔ سندھیوں کو جانتا ہوں۔ وہ اگر غلطی کریں۔ تو ایک سندھی انھیں راہِ راست پر لانے کی کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ وہ عموماً نیک طبع انسان ہیں۔ اس میں ہندو اور مسلمانوں کا کوئی فرق نہیں۔ اس لئے غیر سندھی لوگ مجھے اپنا کام کرنے دیں۔ ایک ملک کے داخلی معاملات میں بیرونی مداخلت مفید ثابت نہیں ہوتی۔

میرا پروگرام نہایت صاف ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اگر کسی مسلمان نے کسی ہندو کا مال لوٹا ہے۔ تو اسے واپس کر دیا جائے۔ اگر کسی مسلمان نے کسی ہندو کو قتل کیا ہے۔ تو عدالت میں جا کر اپنے جرم کا اقرار کرے۔

یہ یاد رہے کہ اس وقت میں شہر کے فسادوں کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ اس کے لئے گورنمنٹ کے ذمہ دار افسروں کو کام کرنا چاہیئے۔

دیہاتی اصلاح میں میں گورنمنٹ کا ایک مددگار بن کر کام کروں گا۔

مسٹر محمد علی جناح سندھی ہیں

میں نے سنا ہے کہ مسلم لیگ کے ڈکٹیٹر مسٹر محمد علی جناح صاحب بالقابہ سندھی ہیں۔ میں ان کی خدمت میں آل انڈیا لیڈر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک سندھی ایک لبرل جنٹلمین کی حیثیت سے عرض کرتا ہوں کہ اگر کبھی مجھے ان سے ملنے کا موقع ملا، تو میں ان کو دو باتیں ذہن نشین

کرنے کی کوشش کروں گا۔

(۱) کیوں انہیں کرسی چھوڑ کر زمین پر بیٹھنا چاہیئے۔

(۲) فیڈریشن سے ہماری کیا مراد ہے میں کیوں فیڈریشن کے سوا ہندوستان کی ترقی کا کوئی امکان نہیں سمجھتا۔ افسوس ہے کہ ہماری نظر میں فیڈریشن کو نہ تو کانگریس سمجھتی ہے۔ نہ لیگ۔ کانگریس کو قائل کرنے کی ہمیں جلدی ہے۔ لیکن لیگ کو اپنا نقطۂ نظر سمجھانا ہم ضروری جانتے ہیں۔

لاہور

میری پارٹی کا دوسرا مرکز لاہور ہے۔ مہاتما جی تصریح کر چکے ہیں۔ کہ ان کا ذاتی فیصلہ یہی ہے کہ اس لڑائی میں برطانیہ کو بلاشرط امداد دی جائے میں ان کے اس فیصلہ کا احترام کرتا ہوں۔ ہوم رول کو جلدی حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ جس پر عدم تشدد کی پابندی سے عمل کر سکتے ہیں۔ اس لئے میں سر سکندر کے فیصلہ کی تائید کرتا ہوں۔ اسکے بعد انہیں یقین دلاتا ہوں۔ کہ اگر آپ بلا شرط امداد کا نتیجہ ہوم رول سمجھتے ہیں! اور اسی امید پر آپ نے یہ جرأت کی ہے۔ تو آپ ہوم رول ہرگز حاصل نہیں کر سکیں گے۔ جب تک نیشنل کانگریس آپ کی تائید نہ کرے۔

میں اپنے احراری دوستوں سے التجا کروں گا کہ ایام جنگ میں ایجی ٹیشن ضرور بند کر دیں۔ جنگ ختم ہونے پر اگر ہوم رول نہ ملا تو آج کی ایک قربانی کے عوض اپنے دس آدمی قربان کرنے کی تیاری

کریں۔ کاش وہ میری گذارش پر غور کرنا منظور کریں۔

دہلی میری پارٹی کا بڑا مرکز دہلی ہے۔ یہاں سے میں پنڈت جواہر لال نہرو کی خدمت میں عرض کروں گا۔ کہ انقلابی ضرورت کے لئے پیچھے ہٹنا انقلاب کے خلاف نہیں۔ کامریڈ لینن اگر جرمنوں کا مفتوحہ علاقہ ان کو دے کر صلح نہ کرتا۔ تو وہ کبھی کامیاب نہ ہوتا۔ آپ اگر مسٹر جناح سے صلح کرنا چاہیں۔ تو میں آپ کو ایسا دروازہ بتلاؤں گا جس سے مسٹر جناح کانگریس میں آجائیں گے۔ میں اس پر یقین نہیں رکھتا کہ ایک انقلابی کانگریسی ایک غیر کانگریسی کے ساتھ مصالحت نہیں کر سکتا ہے۔ اگر ہمارے بتلائے ہوئے راستے سے آپ مسٹر جناح سے مل سکے۔ تو اس کے بعد دونوں مل کر مہاتما جی کو ساتھ لیجئے اور وائسرائے کے توسط سے برٹش نیشن کے ساتھ ایک لمبے وقت کا مستقل پروگرام طے کرائیے۔ ملک کی شکست خوردہ فوج انقلاب کا معنے سمجھنے کی استعداد بھی گم کر چکی ہے۔ بیشک چند نوجوان اپنی محدود ٹولیوں سے انقلابی نعرے لگوا سکتے ہیں۔ اگر ہم پنڈت جی سے مل سکے تو ہم انھیں ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کا فرق سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ ہمارے خیال میں برطانیہ سے تصریح کرانے یا فیصلہ کن اسمبلی کے مطالبہ پر ملک کو سول نافرمانی کی دعوت دینا "کوہ کندن اور کاہ برآوردن" کے برابر ہوگا۔ البتہ مہاتما جی اگر اپنے فیصلے سے اپنی ذمہ داری پر کانگریس کو سول

نافرمانی کا حکم دیتے ہیں۔ تو میں اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کروں گا۔ اس حالت میں میں اپنے آپ کو اور ایک درجن اپنے عزیزوں کو مستثنیٰ کراؤں گا۔ میں محترم سوبھاش بابو سے عرض کروں گا، کہ وہ بنگال میں سول نافرمانی جاری نہ کریں۔ بنگال کی پہلی کامیابی اس کے اعزاز کے لئے کافی ہے۔ اس وقت مہاتما جی کی اطاعت کیجئے۔

حضرات! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اتنا وقت میری باتیں سننے کے لئے متوجہ رہے۔ ہمارے خیالات کو کوئی صحیح یا غلط سمجھے ہم آخر تک ملک کی ترقی اور آزادی کے لئے اپنے استاذ مولانا محمود حسن دیوبندی شیخ الہند کے طریقے پر کام کرتے ہوئے مریں گے۔ اللہ ہمیں توفیق بخشے! بس اس طرح جینا عبادت ہے۔ اور اس دھن میں مرنا شہادت ہے۔

میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ آپ اپنا کانفرنس کا کام سنجیدگی سے شروع کریں اور کامیابی سے فیصلے بنائیں۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین!

خطبۂ صدارت

صوبہ مدراس کے مقام کمباکونم میں اینٹی سیپریشن
(Anti - Separation) کانفرنس منعقدہ
جون سنہ ۱۹۴۱ء میں پڑھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ۔ اما بعد

آپ کی کانفرنس نے مجھے دعوت دی کہ مسلم لیگ کے جدید نظریہ کے متعلق آپ کو اپنے خیالات سناؤں ۔ اس کا شکریہ قبول فرمایئے ۔

میرے حالات شمالی ہند میں تو عام مسلمانوں کو کسی قدر معلوم ہیں، شاید جنوبی ہند کے مسلمان اتنا بھی نہ جانتے ہوں۔ اجازت دیجئے کہ چند کلمات لکھ کر میں اپنا تعارف کرا دوں۔ امید ہے کہ میرے بعض افکار اس کے بعد زیادہ وضاحت سے سمجھے جائیں گے ۔

میں نومسلم ہوں۔ علمی اور سیاسی افکار میں دیوبندی جماعت سے تعلق رکھتا ہوں۔

دیوبندی جماعت

یہ جماعت امام ولی اللہ دہلوی کے طریقہ پر محافظین کی ایک مستقل پارٹی ہے۔ جو ہند کے استقلال تام کو اپنا "کریڈ" مانتی ہے۔ اور اس مقصد کی تحصیل کیلئے ہر ایک آزادی پسند جماعت سے (مسلم ہو یا غیر مسلم) متحد ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کی بیرونی دولتوں میں اس کا اچھا تعارف ہے۔

شیخ الہند

میری استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اس پارٹی کی مرکزی طاقت میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ میں انہیں کے ارشاد سے ۱۵ سال ہند میں کام کرتا رہا۔ پھر انکے حکم سے کابل چلا گیا۔
میں اسلامی تعلیمات کی تحصیل و تکمیل میں عمر کا بڑا حصہ صرف کر چکا ہوں۔ ہندوستان کے اندر اور اسلامی ممالک میں اسلامی ترقی کی کئی اسکیمیں بننے اور انکے ناکام ہونیکا تجربہ رکھتا ہوں۔ یورپ و ایشیا کے کئی ملکوں میں پرانی شاہی حکومتیں تباہ ہوتی دیکھ چکا ہوں۔ اور انقلاب کے بعد نوجوانوں کی کمزور جماعتوں کو کامیابی سے طاقتور حکومتیں بنانیکا بھی کافی مشاہدہ رکھتا ہوں۔ میں جس کام کو اپنے نام سے کہتا ہوں، حقیقت میں وہ نوجوانوں کی ایک جماعت کا کام ہے جنکے ساتھ ملکر کام کر رہا ہوں۔
میری سمع و بصر اور میرے ہاتھ پاؤں وہی ہندوستانی نوجوان ہیں۔ ان میں عربی مدرسے کے طالبعلم اور کالج کے تعلیمیافتہ مساوی درجہ پر شریک رہے۔ نیز تعلیمیافتہ طبقہ میں سے ہندو اور سکھ بھی ہمارے شریک کار تھے۔ آپکو تعجب ہوگا کہ میں آجتک کوئی یوروپین زبان نہیں جانتا۔ محض میرے مطالعہ کیلئے میرے ان رفیقوں نے ہزاروں صفحہ کی کتابیں ترجمہ کیں،
میرے استاد نے اپنی جماعت کے افکار کی نشر و اشاعت کیلئے ایک اجتماعی انجمن بنائی تھی۔ میں اس "جمعیۃ الانصار دیوبند" کا ناظم رہا ہوں۔ اسکے بعد "جمعیۃ علماء ہند" اور "جامعہ ملیہ" کا افتتاح بھی انہیں کے نام سے ہوا۔

کالج پارٹی

دیوبندی جماعت کے بالمقابل وہ لبرل ہیں جنہوں نے علی گڑھ کالج کو اپنا مرکز بنایا۔ کالج پارٹی نے "مسلم لیگ" پیدا کی ہے۔ میں تقریباً ۵ سال تک اپنے استاد کے حکم سے کالج پارٹی سے ملتا رہا ہوں۔ میرے استاد نے میرا تعارف ڈاکٹر انصاری سے کرایا۔

ڈاکٹر صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی سے ملایا۔

ایک دفعہ اس سے پہلے دیوبند چھوڑنے پر مجبور ہوا تھا تو میری استاد سے تعلق کی بنا پر دہلی میں حکیم اجمل خاں ہمارے مربی بنے۔ اور مجھے نواب وقار الملک اور نواب محمد اسحق خاں سے ملایا۔

اب میں اس تمہید کو ختم کرتا ہوں اور اپنے خیالات مختصر الفاظ میں آپ کو سناتا ہوں۔

(۱) حضور نظام ایک مسلمان فرمانروا ہیں جس قدر سیاسی ذمہ داری وہ سمجھ سکتے ہیں غالباً ہندوستان کے اندر رہنے والا مسلمان اسے محسوس تک نہیں کرتا۔ وہ جب اپنی حکومت چلاتے ہیں تو اس حالت میں اپنا مسلمان ہونا بھول نہیں جاتے لیکن وہ اپنی حکومت کو "اسلامی" نہیں کہتے۔ انکے اس دانشمندانہ فیصلہ کی قدر کرو۔ اور ہندوستان کے کسی حصہ کو پاکستان کہنا قطعاً چھوڑ دو۔

(۲) دہلی کا رہنے والا ایک مسلمان اگر گنگا جمنا کے دوآبہ کو اپنا کہنے لگے تو وہ بجا ہے اور اس نے اپنے حق کا اعلان کیا ہے۔ ایسا ہی اگر ایک مدراسی مسلمان مدراس کو اور بمبئی کا رہنے والا مسلمان بمبئی کو اپنا بنائے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

لیکن کیا کوئی عقلمند یہ فیصلہ بھی کر سکتا ہے کہ دہلی بمبئی اور مدراس کے اپنانے میں اس ایک مسلمان کے سوا اور کوئی شریک نہیں۔ اس طرح کی باتیں ایک فاتح یا انہیں کا جائز وارث فرمانروا کہتا ہے۔ کیا اسوقت ہندوستان کا کوئی مسلمان اپنے آبا و اجداد کا صحیح معنی میں وارث بن کر ہند کے کسی خطہ کا مالک کہلا سکتا ہے۔ اس لئے "پدرم سلطان بود" کا فکر دماغ سے نکال دیجئے۔ آپ یقین کیجئے کہ اگر اس فکر میں کسی قدر حقانیت کا وزن ہوتا تو حضور نظام اپنی مملکت کو اسلامی حکومت

کے نام سے موسوم کرنا اپنا فرض قرار دیتے۔

(۳) ہندوستانی مسلمان دو سو برس سے سوتا رہا ہے۔ اس نے اپنے اعلیٰ درجہ کے مفکرین کی بے قدری کی۔ اس نے اپنے خیر خواہوں کو دشمنوں کے ہاتھ سے قتل کرایا۔ اس قسم کی غلطیاں شمالی ہند اور جنوبی ہند کے مسلمانوں کی اکثریت سے تنہا تنہا بارہا ہوتی رہی ہیں۔ ورنہ ٹیپو سلطان اور مولانا محمد اسمٰعیلؒ کی جماعتیں یوں شہید نہ ہوتیں انقلاب کا مرکز بننے کی جو قدرتی صلاحیت ہندوستان کے مسلمان میں مضمر تھی، ان غلطیوں سے وہ انفرادی استعداد برباد ہو چکی ہے۔

(۴) پچھلے پچاس ساٹھ برس سے ہندوستانی مسلمان انقلابی خود اعتمادی کھونے کے بعد بیرونی مسلمانوں کی تھپکیوں سے اور زیادہ غلط اندیش بنتا چلا گیا۔ باہر کا مسلمان عموماً یورپ کے زیر اثر ہو کر ہندوستانی مسلمان کا لیڈر بنتا رہا ہے۔ جس انقلاب نے یورپ کی زمین اور اس کا آسمان بدل دیا ہے یا بدل رہا ہے۔ اس کا اثر اسلامی سلطنتوں پر بھی پڑ رہا ہے۔ چنانچہ اب وہ اپنے بچاؤ کی فکر میں ہیں۔ اسلئے وہ ہندوستانی مسلمان کو قطعاً بھول جائیں گے۔

(۵) میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان بھی اس انقلاب کے اثر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔ یورپ کی جو بڑی سلطنت

سو سال سے اسیر حکومت کر رہی ہے۔۔ وہ اپنے بادشاہ کے نام سے ڈکٹیٹر بن کر ملک کی تمام قوتوں کی تنہا مالک ہے۔ اس کے کارندے اب اپنی پالیسی یورپ کے سانچے میں ڈھالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اور انھیں کے راستہ سے انقلاب ہندوستان پہنچے گا۔

(۶) اگر آپ اپنے نوجوان کو جو انقلابی یورپ سے آشنا ہو چکا ہے اپنا رہنما مان کر اس انقلاب سے عہدہ برآ ہونے کا خیال نہیں رکھتے تو آپ کا وہی حشر ہوگا جو بخارا کے مسلمان کا ہو چکا ہے۔ ان کو دیکھئے ان کے لوٹنے میں کس قدر مسلمانوں نے حصّہ لیا ہے۔

انقلاب جب ظاہر ہوتا ہے تو ایک مفلس مسیحی مالدار مسیحی پر اور ایک مفلس مسلمان مالدار مسلمان پر رحم نہیں کرتا۔

آپ مالداروں کے ایسے جتھے پر بھروسہ نہ کیجئے جو نہ تو فوجی طاقت کا مالک ہے، نہ قانونی اقتدار رکھتا ہے۔ نہ کسی "انٹرنیشنل باڈی" سے اپنا تعارف کرا سکتا ہے۔ آپ فقط اپنے نوجوان کا ساتھ دیجئے۔ وہ اپنے ملک میں قومی حکومت پیدا کرے گا۔ اسے معلوم ہے کہ اشوکا یا شاہجہاں کی حکومت کے زندہ کرنے کا امکان نہیں رہا۔

میں آپ سے عاجزانہ التجا کرتا ہوں کہ پرانے شاہی دور کی واپسی سے مایوس ہو جائیے۔

(۷) اگر کوئی ہندوستانی مسلمان (عالم ہو یا سیاسی لیڈر) آپ سے یہ کہے کہ ہند کے جس قطعہ میں ہماری فی الحال اکثریت ہے، کیوں نہ وہاں ہم اپنا شاہی نظام جاری کرنے کی کوشش کریں، اس سے ہمارا کلچر بھی محفوظ ہو جائے گا۔ اور اسلام کی خدمت بھی قوم کے مستعد افراد کے لئے آسان ہو جائے گی، مثلاً صوبہ سندھ، سرحد اور پنجاب کے بعض حصوں کو ملا کر ہم ایک حکومت بنالیں۔ اسمیں فقط اسقدر محنت کرنا ہوگی کہ اپنے نوجوانوں میں پروپیگنڈا کر کے انھیں اس کام کے لئے تیار کر لیا جائے۔ نیز اگر دنیا میں لادینی نظام نوجوانوں کی طاقت سے پیدا کیا جا سکتا ہے، تو ہمارے اس نظام کے پیدا ہونے سے مایوس نہیں ہونا چاہئیے۔

انکے نزدیک اگر ہند کے کسی گوشہ میں ایسی اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو اقلیت والے صوبوں میں رہنے والا مسلمان بھی غیر مسلموں کے اسلام کش جذبہ کی خونخواری سے محفوظ ہو جائے گا اور ممکن ہے کہ ہند میں اسلامی تاریخ اپنے آپ کو پھر دہرانے لگے۔

اس کے جواب میں میں آپ کی خدمت میں یہی مشورہ عرض کرونگا کہ آپ ایسی اسکیمیں بنانے والوں کی کوئی بات نہ سنیں اور اُنہیں "مشت بعد از جنگ" کہہ کر ٹال دیں۔

جب ٹرکش امپائر جیسی مسلمانوں کی ایک مرکزی سلطنت موجود تھی تو ہم خود اس قسم کی اسکیمیں بناتے رہے۔ ہمارے ساتھ نوجوانوں کی

ایک انقلابی جماعت اس کی تکمیل میں کوشش کرتی رہی ہے۔ ہمیں بین الاقوامی سہولتیں بھی مہیا ہوتی رہی ہیں۔ مگر جب سے ترکی کو شکست ہو چکی ہے ہم اس قسم کی انقلاب انگیز تجویز کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔

ہم گویا آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس تجویز کا اثر برطانیہ اور رشیا دونوں سلطنتوں پر بہت برا ہوگا۔ اور اس کا خمیازہ سب سے پہلے افغانستان جیسی ایک چھوٹی سی اسلامی سلطنت کو بھگتنا پڑے گا۔ اس کے بعد جو انقلاب رونما ہو سکتا ہے وہ قطعی طور پر لادینی ہوگا۔

ایک سیاسی مبصر کے نزدیک اس قسم کی تجویز کے لئے فقط ایک وجہ جواز ہو سکتی تھی۔ کہ سب سے پہلے یہ تحریک انڈین نیشنل کانگریس میں پیش کی جائے۔ کانگریس اس میں جس قدر کاٹ چھانٹ کرے، جس قدر اصلاح اور ترمیم تجویز کرے وہ فیصلہ مان لیا جائے۔ اس کے بعد انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے اس فیصلہ کو برٹش پارلیمنٹ کے سامنے لایا جائے۔ جس قدر ترمیمیں گورنمنٹ ضروری سمجھے وہ بھی سب منظور کر لی جائیں۔

کیا آپ دیکھتے ہیں کہ مسلم لیگ کے کرتا دھرتا جو آجکل ان تجویزوں کا منبع ہیں ان میں اس قسم کے سوچ بچار کا میلان پایا جاتا ہے؟ ؎

جب یہ نہیں تو یا بادہ نسب کہانیاں ہیں

(۵) اس کے بعد اگر آپ ہم سے مسلمانوں کی ترقی کا پروگرام پوچھیں

تو ہم آپ کو اس وقت اس سے زیادہ نہیں تبلائیں گے کہ آپ اپنے نوجوان پر جو انقلابی یورپ سے آشنا ہے اور ہر قدم پر تبدیلی کو نہایت غور سے دیکھتا ہے، اس پر پورا اعتماد کیجئے۔

ہم اس کی قوتِ اجتہاد پر اعتماد کرتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے حالات کے مطابق اپنے لئے راستہ نکال لے گا۔ ہم نے دس ہیں نوجوانوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ وہ اگر افغان نوجوان کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں تو ان سے آگے رہتے ہیں اس کے بعد یورپ کی مسلم اور غیر مسلم قوموں ہیں کام کرنے میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

میرا خیال ہے کہ تنہا لاہور ہمیں بیس ہزار نوجوان ایسے دے سکتا ہے جو ان نوجوانوں کی طرح کامیابی سے آگے بڑھیں اور اسی طرح تنہا دیوبندی نظام اس قسم کے چالیس ہزار نوجوان مہیا کر سکتا ہے۔ جو ان نوجوانوں کے ساتھ مل کر کام کر سکیں۔

پروگرام کی تفصیلات کو آخری شکل میں معین کرنے کا تو یہ وقت نہیں ہے، مگر ہم چند ایسے اہم نکات ضرور بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہمارا نوجوان دھوکہ نہ کھائے۔

(الف) اسلام حقیقت میں ایک انٹرنیشنل پروگرام ہے جو انسانیت کے لئے ضروری ہے۔ قرآن عظیم نے عربی نیشن کو بطور واسطہ استعمال کیا تھا

چنانچہ اس کے تھکنے پر عجمی قوموں نے وہ بوجھ اپنے سر لیا. حجاز اور دمشق کے بعد بغداد، بخارا، غزنی اور دہلی کی تاریخ اس پر شاہد ہے. مگر آج ہم اپنے نوجوان کو انٹرنیشنلسٹ بننے سے روکتے ہیں کیونکہ اسلامی انٹرنیشنلزم کا تو کوئی اجتماعی مرکز رہا نہیں. اور لادینی انٹرنیشنلزم کا زور شور سے منظم پروپیگنڈا ہو رہا ہے۔ وہ لوگ اپنے مطلب میں کامیاب ہونے کے لئے نہایت عمیق چالیں چل رہے ہیں۔ ہم ڈرتے ہیں کہ ہمارا نوجوان دھوکہ سے لادینی نہ بن جائے۔ اس معاملہ میں ہم اپنے تجربے رکھتے ہیں۔

اسی طرح ہم ایک ہندوستانی عالم کو اس سے روکتے ہیں کہ وہ کسی مسلمان بادشاہ کا انتظار کرے جو باہر سے آئیگا. ہم جانتے ہیں کہ کوئی مسلمان بادشاہ تو باہر سے آ نہیں سکتا اور یہ بھولا مسکین کسی لادینی دولت کے پیچ میں نہ پھنس جائے۔

(ب) ہمارا نوجوان جمہوری نظام کے سوا اور کسی نظام کو نہ مانے قوم کے جمیع افراد کی پوری طاقت استعمال کرنا بجز اس نظام کے ممکن نہیں. ہماری قوم کا اعلیٰ طبقہ عموماً برباد ہو چکا ہے بجز ان چند نیک بندوں کے جو پسماندہ جماعت کے اٹھانے میں جد وجہد کر رہے ہیں۔ اسی نظام کو ہم جمہوری مانتے ہیں۔ نکمے مالداروں اور رہبانیت سکھانے والے عالموں کا اس نظام میں کوئی دخل نہیں۔

(ج) ہماری تلقین کے موافق جس جماعت نے نیشنلزم اور جمہوریت پر یقین پیدا کر لیا ہو اسکو پوری ذمہ داری سے ہم یقین دلاتے ہیں کہ انڈین نیشنل کانگریس کا نظام لادینیت سے بچنے کے لئے ایک مستحکم حصار کا کام دے گا۔ اس کا تجربہ ہم اپنی ذات پر یورپ میں کر چکے ہیں۔

ہمارے خیال میں لادینیت کا پروپیگنڈہ عموماً اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ اپنی سیاسی مرکز کی ڈکٹیٹر شپ کو وسیع کیا جائے لیکن جب ایک نیشنلسٹ کو یہ لوگ اپنے اندر شامل کرنے سے مایوس ہو جاتے ہیں تو اس پروپیگنڈے کا رُخ بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کا ممبر ان کے حلقہ اثر سے قطعاً خارج ہے، وہ لوگ ہر ایک سوشلسٹ کو قبول کر لیتے ہیں۔ مگر جن لوگوں نے نیشنل کانگریس کے اندر اپنی سوشلسٹ پارٹی بنائی ہو انھیں وہ اپنے مرکز سے ملحق نہیں مانتے۔

(د) جب آپ نیشنل کانگریس میں جانے کا عزم کر لیں تو ہمارا مشورہ آپ کے لئے یہ ہوگا کہ آپ اپنی مستقل پارٹی بنائیں، نہ تو گاندھی جی کی پارٹی کے پیچھے چل کر ہماری طرح کا ایک مسلمان کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ سوشلسٹوں میں مل کر وہ مسلمان عوام میں اپنی تحریک بآسانی چلا سکتا ہے۔ اس لئے اپنی پارٹی کو ان اعلیٰ اصول پر منظم کیجیے، جہاں آپ کا مذہب اور دنیا کا اقتصادی نظام باہم مل جاتے ہیں۔ اس پارٹی کا آئیڈیا نہایت معقول اور

نظام نہایت مضبوط ہو۔ ممبروں کی کمی و زیادتی پر نظر نہ رکھی جائے ہندوستانی مسلمان کی طاقت بہت زیادہ ہے جسے وہ خود محسوس نہیں کرتا۔ ایک عقلمند اقلیت بھی اپنی پارٹی کو ملک کی رہنما جماعت بنا سکتی ہے اور ہندوستان کی دوسری قوموں سے مسلمان میں یہ صلاحیت زیادہ ہے۔ اس کے ساتھ ہم نوجوانوں کو وصیت کرتے ہیں کہ اپنے ہم مسلک نیشنلسٹ (مسلم وغیر مسلم) ہندوستانیوں کو اپنی پارٹی میں جمع کرتا رہے۔ اور انکے مالدارو کو نز دیک نہ آنے دے اور چند روزہ زندگی بھوک سے نہ گھبرائے۔

(ھ) یہ پارٹی آگے بڑھکر برطانوی حکومت سے ڈومینین اسٹیٹس کا چارج حاصل کرے۔

(و) یہ پارٹی جرأت کرکے نیشنل کانگریس کو اندرونی نقطۂ نظر سے انٹرنیشنل کانگریس بنادے۔ ہر ایسے اجتماع کو جو ایک زبان بولتا ہے اور معاشرت میں متقارب ہے۔ ایک قوم تسلیم کرے اسکی زمین کو صوبہ نہ کہے بلکہ اسے اسٹیٹ بنا دیا جائے۔ اس طرح آبادی میں مذہبی قلت و کثرت کا اثر صوبوں تک محدود ہو جائے گا۔ ہر ایک اسٹیٹ میں قانونی طاقت تو اکثریت کے قبضہ میں ہوگی مگر قوۃ تنفیذ میں اقلیت کے لائق افراد پوری عزت اور احترام کے ساتھ شریک رہیں گے۔ اس طرح قلت اور کثرت کا تنافر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاوے گا۔

(ذ) فیڈریشن کے مرکز میں برطانوی طاقت کے ساتھ ہر ایک اسٹیٹ کے نمائندے شامل کر دئے جائیں جنہیں سٹیٹ ملک کی مرکزی پارلیمنٹ میں بھیجے گی مرکز کے قبضہ میں فقط ڈیفنس اور معاملات خارجیہ ہوں گے۔

(۹) (الف) مگر اس سے پہلے ضروری ہے کہ یہ پارٹی انڈین نیشنل کانگریس کو اس تمام قرضہ کے تسلیم کرنے پر تیار کر دے جو برٹش گورنمنٹ برہند کے نام سے عائد ہے۔

(ب) نیز نیشنل کانگریس کو یہ بھی قبول کرا لیا جائے کہ ڈیفنس کے لئے ملک کو تیار کرنے کے زمانہ میں فوجی آفیسر برطانیہ ہی سے مستعار لئے جائیں گے۔

ہمارے خیال میں جب تک کانگریس اس قسم کے جسقدر ضروری فرائض ہیں، ان کے ادا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ اُسے فقط سول نافرمانی کرنے سے ڈومنیین اختیارات نہیں ملیں گے۔

(۱۰) ہم چاہتے ہیں کہ نیشنل کانگریس کے اندر نئی پارٹی کھڑی کریں۔ جو اصول مذکورہ بالا کی پابندی سے ملک کے لئے ترقی کا راستہ کھولدے۔ کیونکہ ہم "نان وائیلنس" کے پروگرام، اور انقلاب میں مذہب کے احترام، ان دو اصول کے سوا گاندھی جی کے کسی پروگرام کو نہیں مانتے۔ اور نہ ہم سوشیلسٹوں کی لادینی کو برداشت کر سکتے ہیں۔ ان مصلحتوں

کا لحاظ کرتے ہوئے ہم "ولی اللہ فلاسفی" کو پارٹی کا عقلی اساس قرار دیتے ہیں اور بیت الحکمۃ میں ہم یہی فلاسفی سکھلاتے ہیں۔

(۱۱) اگر ہماری پارٹی انڈین نیشنل کانگریس کو اس جمود سے نکالنے میں کامیاب ہو جائے تو۔

(الف) ہم اپنے ملک میں معاشی نظام کے مالک بن جائیں گے۔ ریزرو بینک پر ہمارا قبضہ ہوگا ہم اپنا بجٹ آمدنی سے متوازن بنائیں گے۔ ہم ہر ایک ہندوستانی کو روٹی کپڑا مہیا کریں گے۔ ہم اپنے مزدور اور کاشتکار کو یورپ کے مزدور اور کاشتکار سے معاشی حالت میں پیچھے نہیں رہنے دیں گے۔

(ب) ہم ہندوستانی زبانوں کو رومن کیریکٹر میں لکھنا ضروری بنادیں گے اس سے بہت سے بیکار جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔

(ج) ہم ہر مرد عورت کے لئے اس کی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا اور ہر مرد و عورت کا ملک کی مدافعت میں حصّہ لینا ضروری قرار دینگے۔

(د) ہم یورپ کے مختلف اقوام میں سے جس قدر نیک انسان ہماری ملکی ترقی کی امداد کے لئے ہمارے ملک میں آنا چاہیں، ہم انھیں اپنے اختیار سے داخلہ کی اجازت دے سکیں گے۔

(۱۲) اب میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔ اسوقت بعض تفصیلی باتوں کا

تذکرہ اس پلیٹ فارم سے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ورنہ جس قسم کے تجربات کا میں مالک ہوں، مجھے بوڑھے کو سمجھا دیتا کہ کیوں ہند میں اسلام کی حفاظت کے لئے انڈین نیشنل کانگریس کے سوا اور سب راستے بند ہو چکے ہیں، اور کس طرح کانگریس میں غیر مسلم میجارٹی کے ہوتے ہوئے خدام خلق کی تحریک سے اسلام کی ترقی کا راستہ کھولا جا سکتا ہے

ہم اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کرتے ہیں کہ خدام خلق یا خدام انسانیت طیار کرنے کے لئے ہم نے شیخ الہند کی یادگار کے نام سے توکلاً علی اللہ جامعہ ملیہ میں "بیت الحکمۃ" کھول دیا ہے۔ اگر خدا کو منظور ہے تو ہم اپنے نوجوانوں کو بہت جلد اپنا مطلب سمجھا دیں گے۔ صلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا محمد خاتم النبین و سید المرسلین و آلہ و اصحابہ وسلم

و آخر دعونا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

خطبۂ صدارت

گذشتہ مارچ میں دہلی سے دیوبند، لدھیانہ اور قصور رہوتے ہوئے مولینا لاہور پہنچے، تو آپ کی صحت خراب ہو چکی تھی۔ لاہور کے قیام میں اسہال کی شکایت بہت بڑھ گئی، علاج ہوا، لیکن چونکہ مولینا اپنے زیر تجویز کاموں کی فکر میں جسم اور دماغ کو بیماری میں بھی آرام نہ لینے دیتے تھے۔ اور عمر کے ساتھ ساتھ اس سلسلہ میں آپکی بے تابی اور اضطراب روز بڑھتا جاتا تھا۔ اس لئے علاج سے چنداں فائدہ نہ ہوا۔ اسی زمانہ میں سندھ کے عربی طلبہ نے حضرت مولینا کو جمعیت الطلبہ کے اجتماع کی صدارت کیلئے باصرار بلایا۔ مولینا باوجود صحت کی خرابی کے حیدرآباد پہنچے اور نوجوان طلبہ کو خطاب فرمایا۔ جمعیت الطلبہ سندھ کا یہ اجلاس ۱۷ اپریل ۱۹۴۴ء کو منعقد ہوا تھا۔

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد۔ میں سولہ برس کا تھا، اور اردو میں میٹرک کے درجہ تک تعلیم پا چکا تھا کہ میں مسلمان ہوا۔ مجھے کلمۂ توحید حضرت حافظ صاحب محمد صدیق قدس سرہٗ بھرچونڈی والوں نے پڑھایا۔ حضرت میرے لئے ماں باپ کی بجائے تھے، اور ماں باپ کی طرح وہ میرے مربی بنے۔ ان کی دعا کی تاثیر سے میں اپنے اندر بڑی برکتیں محسوس کرتا ہوں۔ میں نے کتنی ہی غلطیاں کی ہوں گی لیکن حضرت حافظ صاحب کی دعا کی برکت سے خدا تعالےٰ نے مجھے ان کے شر سے بچا لیا۔ میں اپنے آپ کو حضرت صاحب کی جماعت کا ایک فقیر

لہ حضرت مولینا نے یہ خطبہ سندھی زبان میں دیا۔ آپ بولتے جاتے تھے، اور بعض نیاز مند شاگرد اُسے لکھتے جاتے تھے۔ بعد میں اس خطبے کو ایک پمفلٹ کی شکل میں چھاپ دیا گیا۔ مولینا کے ایک شاگرد شیخ الصدیق ابوسعید بن عبدالرحمٰن عبدالمجید سندھی نے اسکا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

سمجھتا ہوں۔ ان کی دعا سے میں طالب علمی کرتے کرتے حضرت مولینا شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچا۔ اور ان کی جماعت کا ایک طالب علم بن سکا۔ میری حیثیت حضرت مولینا شیخ الہند کی جماعت کے ایک طالب علم کی زیادہ نہیں۔

میرا علمی تعلق بنیادی طور پر حضرت مولینا شیخ الہند سے ہے۔ میرے استاد مولینا محمد قاسم قدس سرہٗ کے شاگردوں میں ایک خاص مرتبے کے مالک تھے۔ میں اپنے استاد کا یہ مرتبہ پہچانتا ہوں۔ اور میری کوشش یہ ہے کہ حضرت کے اس مرتبہ کو زندہ رکھوں۔ ان کو حضرت مولینا محمد قاسم کے واسطہ سے جو علم بطور وراثت کے امام ولی اللہ قدس سرہٗ کا ملا تھا، خدا کے فضل سے مجھے اس کا بہت کچھ حاصل ہے۔ میری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ یہ علم ہندوستان کے مسلمانوں میں بالعموم اور دہلی اور جہاں جہاں اردو بولی جاتی ہے، اور صوبہ سندھ میں خاص طور پر محفوظ ہو جائے۔

قرآن شریف کے معانی و مطالب کو سمجھنا، میری طبیعت کو سب سے زیادہ رغبت اس موضوع علم سے رہی ہے۔ اور چونکہ قرآن شریف کی تعلیمات میں سب سے اہم مسئلہ توحید کا اثبات اور شرک کا انکار ہے۔ اس لئے مجھے اس مسئلہ سے خاص دلچسپی تھی۔ میں نے اسلام کا اعلان کرنے سے پہلے اس سلسلہ میں خود گھر میں جو مطالعہ کیا تھا۔ اس میں یہی بات مجھ پر ظاہر ہوئی تھی کہ اسلام ہی دراصل توحید کی صحیح تعلیم دیتا ہے اور اسی بنا پر میں نے اسلام کو دوسرے مذاہب

پر ترجیح دی تھی۔ بیشک ہندو مذہب عیسائیت اور یہودیت کی طرح پرانے زمانے میں سچائی کا مالک تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس میں اب شرک مل گیا ہے۔ آپ کو اگر ہندو مذہب کی حقیقت معلوم کرنا ہو تو حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے مکتوبات پڑھئے جو "کلماتِ طیبات" نام کی کتاب میں آپ کو ملیں گے۔

قرآن شریف کی تعلیمات کے اصل اصول یعنی اس مسئلہ توحید کو صحیح طرح سمجھنے میں مولینا شاہ اسماعیل شہید کی کتاب "تقویۃ الایمان" نے میری رہنمائی کی تھی۔ چنانچہ میں حضرت مولینا شہید کو شروع ہی سے اپنا ہادی اور مرشد مانتا آیا ہوں۔ بعد میں جب میں نے مسئلہ توحید کے متعلق اپنا مطالعہ بڑھایا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس توحید کے مسئلہ کے ضمن میں مسلمانوں میں وہابی اور غیر وہابی کا جھگڑا بڑے زوروں پر چل رہا ہے۔ مجھے مسلمانوں کا یہ اختلاف پسند نہ آیا اور اس کا حل آخر میں نے یہ ڈھونڈا کہ میں قادری طریقے کا ایک فقیر ہوں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی کتاب "فتوح الغیب" کو مانتا ہوں۔ اس میں توحید کا مفصل بیان ہے اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی اس کتاب کو وہابیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اب اگر میں توحید کو سمجھانے کے لئے "فتوح الغیب" کو اپنے لئے مرکزی اور اساسی کتاب بناتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سندھ سے مسئلۂ توحید کے ضمن میں وہابیت کا سوال گم ہو جاویگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے اس طرز فکر سے سندھ کی پوری

سرزمین سے یہ ناگوار بحث ختم ہوگئی، لیکن اتنا تو ضرور ہوا کہ میرے ساتھیوں اور میرے ساتھ کام کرنیوالوں میں وہابی اور غیر وہابی کا جھگڑا زور نہ پکڑ سکا۔ میرا اپنا یہ حال ہے کہ میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کی کتاب "فتوح الغیب" کو بڑی محبت سے پڑھتا ہوں۔ اور مولینا محمد اسماعیل شہید کی کتاب "تقویت الایمان" کو اس کا ترجمہ سمجھتا ہوں۔

اسلام کے اصل اصول مسئلۂ توحید کے بارے میں تو میرا یہ مسلک ہے، جو ابھی بیان ہوا۔ اپنے استاد حضرت شیخ الہند سے ہم نے جو خاص باتیں سیکھی ہیں، ان میں سے ایک اہم چیز جہاد کا مسئلہ ہے۔ ہماری طالب علمی کے زمانہ میں اس مسئلہ پر ملک میں بڑی تحقیقیں ہو رہی تھیں۔ علی گڑھ پارٹی جہاد کے معنی نئے طریقے پر کرتی تھی اور اس سلسلہ میں ایسے شبہات لاتی تھی جن کا جواب دینا آسان نہ تھا خدا کے فضل سے ہمیں حضرت شیخ الہند کی صحبت کے فیض سے اس مسئلہ میں پورا اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔ چنانچہ علی گڑھ کے طلبہ سے اس معاملہ میں اگر ہماری گفتگو ہوتی تو ہم انہیں جہاد کا مقصود اصلی صحیح طرح سمجھا سکتے تھے۔

قرآن مجید کا ترجمہ، "فتوح الغیب" کی توحید، اور جہاد اپنے اصلی معنوں میں یہ تھا ہمارا مقصد، جس پر ہم نے اپنی علمی سرگرمیوں کا مدار رکھا۔ امروٹ (ضلع سکھر) میں ہم یہی چیز پڑھاتے رہے۔ مسئلہ جہاد کی توضیح اور اس کی عملی تعبیر کے لئے ہمیں امام ولی اللہ، امام عبد العزیز اور شاہ اسماعیل شہید اور

ان کے ساتھیوں کی تاریخ اور ان کے حالات پڑھانے کی ضرورت پڑی۔ بات یہ تھی کہ جہاد کو محض عقلی طور پر سمجھا دینا ہمارے نزدیک کافی نہ تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ طلبا کے سامنے اس کا عملی طریقہ بھی پیش کریں۔ اور سب جانتے ہیں کہ امام ولی اللہ سے لے کر مولانا اسماعیل کی شہادت تک اس خاندان کا جہاد کے واقعات سے خصوصی تعلق رہا ہے۔ ہم نے دیوبند میں زمانہ طالبعلمی کے دوران میں اس خاندان والاتبار کے حالات بزرگوں سے سُنے تھے۔ چنانچہ اب جو ہم نے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا تو ہم یہ کرتے کہ پہلے تو قرآن مجید سے جہاد کا مسئلہ طلبہ کو سمجھاتے، بعدہٗ صحیح احادیث سے اس پر روشنی ڈالتے۔ پھر صحابہ رضوان اللہ علیہم کے حالات زندگی اس بارے میں پیش کرتے۔ اور اس کے بعد امام ولی اللہ کے طریقہ سے احکام جہاد کو منطبق کرتے۔ اور آخر میں طلبہ پر واضح کرتے کہ کس طرح آج کے زمانے میں۔ موجودہ حالات کے مطابق جہاد کا حکم قابل عمل ہو سکتا ہے۔

توحید اور جہاد، یہ دو چیزیں تھیں جن پر ہم طلبہ کو تعلیم دیتے وقت خاص زور دیتے تھے۔ توحید اور جہاد کی اس طرح تعلیم دینا ہر مسجد اور ہر مدرسہ میں ممکن نہ تھا۔ امروٹ ضلع سکھر میں حضرت مولینا تاج محمود رحمۃ اللہ علیہ ہمارے لئے مثل باپ کے تھے۔ چنانچہ وہاں ہم آرام و اطمینان سے حسب منشا تعلیم دیتے رہے، امروٹ میں کچھ عرصہ پڑھانے کے بعد حضرت شیخ الہند نے اپنے

کام میں ہمارا درجہ بڑھا دیا۔ اور آپ نے ہمیں سندھ میں کام کرنے کا اور طریقہ بھی سمجھایا۔ ہم نے انکے حسب ارشاد کام شروع کر دیا۔ اور کسی سے اس کا ذکر تک نہ کیا کہ ہم یہ کام حضرت شیخ الہند کا بتایا ہوا کر رہے ہیں بظاہر ہم اس کام کو اپنے نام سے کر رہے تھے۔ میرے مشفق بزرگ حضرت صاحب امروٹی کو میرا اس طرح کام کرنا پسند نہ آیا۔ چنانچہ ہم مجبور ہو گئے کہ امروٹ کی بجائے گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد سندھ میں دار الرشاد کے نام سے ایک مدرسہ بنا دیا۔ ہمیں اس مدرسہ کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے میں پورا اختیار تھا۔ اور پیر صاحب گوٹھ پیر جھنڈا کا ہمارے ساتھ فیصلہ ہو چکا تھا کہ وہ ہمارے کام میں بالکل دخل نہ دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس عہد کو سچے دل سے نبھایا۔

دار الرشاد میں جب ہم نے اپنے کام کو اچھی طرح سے کر کے دکھایا تو حضرت شیخ الہند نے ہمارا درجہ اور بڑھا دیا اور آپ نے مجھے دیوبند بلوا بھیجا۔ اور یہاں مدرسہ دیوبند کی پالیسی میں ہمارے مشوروں کو سننے لگے۔ اسی زمانے میں حضرت شیخ الہند نے ہمیں جہاد کی حقیقت کا دوسرا بطن سمجھایا۔ عام طور پر جہاد کے لئے یہ شرط ہے کہ مسلمان بادشاہ ہو اور کفار کے مقابلہ کا مسلمانوں میں کوئی امکان نظر آئے تو پھر جہاد فرض ہوتا ہے مگر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں ان کا کوئی بادشاہ نہ رہے اور نہ ان کے ہاں فوجی طاقت موجود ہو۔ تو ان حالات میں جہاد کا حکم

کیا موقوف ہوجائے گا؟

حضرت شیخ الہند نے اس مشکل مسئلہ کو ہمیں سمجھایا۔ اور اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا کہ ایسے حالات میں ہر ایک مسلمان پر فرض ہے کہ وہ خود اپنی جماعت بنائے اور جہاد کرے۔ حضرت نے سندھ میں ہمیں اس طرح کام کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ چنانچہ ہم قدرے اس کام سے واقف ہوچکے تھے۔ اور جب ہم سندھ سے دیوبند پہنچے اور جمعیت الانصار کا کام کرنا شروع کیا تو ہمارے پیش نظر حضرت شیخ الہند کا یہی فرمان تھا۔ جہاد کے متعلق یہ نقطۂ نظر اور اس کے مطابق کام کرنا، یہ ہماری خصوصیت تھی، اور ہم نے حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی صحبت میں رہ کر اسے حاصل کیا تھا اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ حضرت کو ہمیں کابل بھیجنے کی ضرورت پڑی۔ وہاں پہلے پہل ہم نے جہاد کے پہلے بطن کو اپنا مقصود بنا کر کام کیا۔ یعنی مسلمان بادشاہ کی موجودگی اور مسلمانوں کی فوجی طاقت کے ہوتے جہاد کے حکم کی تعمیل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد حالات ایسے رونما ہوئے کہ ہمیں کابل چھوڑنا پڑا۔ چنانچہ وہاں سے ہم روس چلے گئے۔ روس کی سیاست کا جو ہم نے مطالعہ کیا تو ہمیں یہ بات سمجھ میں آگئی کہ جہاد کا بطن ثانی جو ہم نے حضرت شیخ الہند سے سیکھا تھا۔ یعنی جب مسلمانوں کی حکمراں طاقت اور ان کی فوجی قوت موجود نہ ہو تو اس وقت ہر ایک مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنی جماعت بنائے اور جہاد کرے، اسی

کو یورپ میں انقلاب کا نام دیا جاتا ہے، اس زمانہ میں روس یورپ کے انقلاب کا مرکز تھا۔ ہم وہاں سات مہینے رہے۔ اور یورپ کے اس انقلاب کا بڑی اچھی طرح سے مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم نے دیکھا کہ جہاد کا دوسرا بطن جس کا مکمل بیان حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفا میں ہم بار بار پڑھ چکے تھے، اسی کو آج کی اصطلاحی زبان میں انقلاب کہتے ہیں۔ چنانچہ اب میں انقلابی ہوں

میں اپنے اس انقلاب کو اپنے وطن میں کامیاب کرنے کے لئے نیشنل کانگرس کے اندر اپنی ایک مستقل پارٹی کی بنیاد ڈال چکا ہوں۔ جب ہم وطن سے باہر تھے تو ہماری اور حیثیت تھی لیکن جب سے ہم وطن واپس لوٹے ہیں، ہم اپنے باہر کے رفقاء سے قطع تعلقات کر چکے ہیں۔ اب ہماری ساری کوشش یہ ہے کہ ہم اپنے اس فکر کا حضرت شیخ الہند کی جماعت میں سے جو آگے بڑھنے والے نوجوان ہیں، ان سے تعارف کرا دیں۔ لیکن کانگرس کے اندر رہ کر کام کرنے کی اس دعوت سے کوئی یہ دھوکا نہ کھائے کہ ہم نیشنل کانگرس میں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح گاندھی جی کے تابع ہیں۔ نہیں۔ نیشنل کانگرس کے اندر ہمارے کاموں اور خدمات کی ایک مستقل حیثیت ہے۔ گاندھی جی کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کاموں پر روشنی ڈالنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ ہمارا اور گاندھی جی کا اس سلسلہ میں صرف ایک معاملہ میں اشتراک ہے اور وہ عدم تشدد کا مسئلہ ہے۔ لیکن ان

میں بھی ہماری اور گاندھی جی کے درمیان فرق ہے وہ کسی صورت میں بھی تشدد کے روا دار نہیں۔ مگر ہم جب ضرورت ہو تو اس امر کا اعلان کرکے تشدد کرنے کے حق میں ہیں
شروع شروع میں عدم تشدد کو اپنے اس فکر کو بیشک ہم گاندھی جی کا اثر مانتے تھے مگر بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ کے زمانہ قیام میں عدم تشدد کے پابند تھے۔ دراصل امام ولی اللہ کی تحقیقات نے ہماری اس مسئلہ میں رہنمائی کی ہے۔ چنانچہ اب ہم عدم تشدد کی دعوت دیتے ہیں، تو ظاہراً و باطناً ہم فقط امام ولی اللہ کے اتباع کی دعوت دے رہے ہیں جس طریقہ پر یورپین اقوام نے اپنا انقلاب منظم کیا، اسی طریقہ پر میں امام ولی اللہ کی دعوت انقلاب کو منظم کردوں گا۔

روس کے انقلاب کی دو مرکزی شخصیتیں ہیں۔ کارل مارکس اور لینن ہیں نے اپنی انقلابی دعوت کے لئے امام ولی اللہ اور امام محمد قاسم دو امام چنے ہیں۔ انقلاب روس لادینی ہے اور میرا انقلاب امام ولی اللہ کی تعلیمات کا عین خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

انقلاب ایک دن میں تکمیل پذیر نہیں ہوا کرتا۔ انقلاب کا کام درجہ بدرجہ ہوتا ہے۔ اس وقت ہم فقط انقلابی فکر کا تعارف کراتے ہیں۔ دیوبند میں علماء کی ایک بڑی جماعت ہے جو جہاد کے مسئلہ میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ ہم فکر نہیں۔ ہم ان کے علم و تقویٰ کی تو عزت کرتے ہیں۔ لیکن ہم ان کے کاموں

کو اپنے لئے قابل تقلید نہیں مانتے۔ حضرت شیخ الہند کے ماننے والے اور ہم فکر علماء کے بھی دیوبند میں دو حصے ہوگئے ہیں۔ ایک تو اس امر کا منتظر ہے کہ کوئی مسلمان بادشاہ جہاد کرے تو ہم اس جہاد میں شریک ہوں۔ اس گروہ کو ہم قابل تقلید نہیں مانتے۔ حضرت شیخ الہند کے ماننے والوں کا دوسرا حصہ انقلابی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ لوگ حضرت کے صحیح قائم مقام ہیں۔

ہم جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت مولینا شیخ الہند نے جہاد کے معنی انقلاب کے بتائے تھے، تو یہاں ہم اس بات کی قدرے توضیح کر دیتے ہیں۔ ہم نے امروٹ میں چار طلبہ کی ایک جماعت بنائی تھی، جس کا مقصد جہاد کرنا تھا۔ میں اس جماعت کا امیر تھا۔ یہ جماعت مولینا اسماعیل شہید کے اسوۂ جہاد پر بنائی گئی تھی۔ ہم نے اس جماعت کے ساتھ جہاد کا کام شروع کر دیا۔ بعد میں جب ہم دیوبند گئے اور حضرت شیخ الہند سے بسبیل تذکرہ اس کا ذکر ہوا تو حضرت قدس سرہٗ نے اس پر بہت اظہار مسرت فرمایا اور آپ نے ہمیں خاص اپنی جماعت میں داخل کر لیا۔

اب اوپر کی بات کی ہم تھوڑی سی تفصیل یہاں اور کرتے ہیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید نے ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ جہاد قائم رکھنا فرض کفایہ ہے۔ اگر طاقت کے زور سے جہاد کا قیام ممکن نہ ہو تو شہید ہو کر بھی جہاد کو قائم رکھا جائے۔ یہ ہر ایک مسلمان کے ہاں میسر ہے۔ اس کے لئے ایک جماعت

بنائی جائے، تو اس جماعت کا سرنار منتخب کیا جائے۔ جیسے نماز کے لئے امام کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ حضرت شاہ شہید کا یہ اشارہ میری سمجھ میں آگیا اور میں نے اس کے مطابق امروٹ ضلع سکھر میں ایک جماعت بنائی اور ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم شہید ہو کر جہاد کو زندہ رکھیں گے۔ بعد میں جب اس کا تذکرہ حضرت شیخ الہند کے سامنے ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ تجھے اس جماعت کی بھی ضرورت نہیں، تو اکیلا جہاد کر سکتا ہے۔ اور فاتح بھی ہو سکتا ہے۔ اور آپ نے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ یہ میری اپنی رائے ہے۔ میرے استاد کی سمجھائی ہوئی بات نہیں! ور میں نے فلاں حدیث سے اس کا استنباط کیا ہے۔

اگر جہاد کا یہی مطلب ہے جو مجھے حضرت شیخ الہند نے بتایا تھا تو اسی کا نام انقلاب ہے۔ چنانچہ اب میں انقلابی ہوں۔ اور جو طریقہ حضرت شیخ الہند نے مجھے بتایا، اسی طریقے کا انقلابی ہوں۔ میرے استاد حضرت شاہ شہید حضرت امام عبدالعزیز اور حضرت امام ولی اللہ قدس اللہ اسرارہم کے مسلک پر عامل تھے۔ یہی میری زندگی کا بھی مسلک ہے۔ اور اسی کا حاصل کرنا میری تمام جدوجہد کا خلاصہ ہے۔

ہم دو مسئلے اور بھی یہاں ذکر کر دیتے ہیں۔ سب سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند کا یہ انقلاب کیسے عمل میں لایا جائے؟ میرا کہنا یہ ہے کہ اس کیلئے ہمیں یورپ سے سیکھنا ضروری ہے۔ ہمارے پرانے ہتھیار اس زمانے میں کسی کام کے نہیں رہے۔ کمال پاشا اور امان اللہ خان اس بات کو خوب سمجھ

گئے تھے اور ہم بھی باہر رہ کر اس حقیقت کو اچھی طرح جان گئے ہیں۔ یورپ کی سائنس۔ اور یورپ کے حربی فنون ہمیں یورپ سے سیکھنے ہوں گے۔ لیکن ہماری انقلابی جماعت کا پروگرام امام ولی اللہ کے فکر پر مبنی ہوگا۔ جب ہم اپنے اہل ملک کو کہتے ہیں کہ "یورپین بنو" تو ہمارے اس کہنے کا دراصل یہی مطلب ہوتا ہے۔

جب یہ تسلیم کر لیا کہ ہمارے لئے یورپ سے سائنس اور فنون کا حاصل کرنا ضروری ہے تو صاف ظاہر ہے کہ ان چیزوں کو ہم انگریزوں سے بطریق احسن سیکھ سکتے ہیں۔ اس لئے میری رائے میں مناسب اور موزوں یہ ہے کہ ہم انگریزی بولنے والی اقوام کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کریں۔ اس میں ہمارا فائدہ ہے اور مصلحت بھی اس امر کی مقتضی ہے۔ اس کو میں "برٹش کامن ویلتھ" کے اندر رہنا کہتا ہوں۔ ہم سندھ کو ڈومینین سٹیٹ بناتے ہیں۔ اور برٹش کامن ویلتھ کے اندر رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں میری اپنی ہے۔ میرے استاد کی بتائی ہوئی نہیں۔ لیکن پچھلی جنگ میں ترکی کی شکست اور مسلمانوں کے بین الاقوامی مرکز ٹوٹنے کے بعد انہوں نے آئندہ کے بارے میں کچھ ارشادات فرمائے تھے۔ جن سے اس قسم کا مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور بات جو گو ایک زائد چیز ہے، ہم اس موقعہ پر کہے دیتے ہیں۔ اس جلسہ میں بعض دوستوں نے کسان اور زمیندار کا ذکر چھیڑا ہے ہم

بھی کسان کے طرفدار ہیں۔ ہم کسانوں کو تعلیم دینا چاہتے ہیں، ان کی سیاسی تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس قابل بنانا چاہتے ہیں کہ وہ اسمبلی میں نمائندہ بن کر بیٹھ سکیں۔ ہم کسان کے لئے سب کچھ چاہتے ہیں لیکن ہم اس کو زمیندار سے ٹکراتے اور لڑاتے نہیں، ہمارے ملک میں زمیندار کا آج ایک درجہ ہے، وہ زمین کا لگان کسانوں سے وصول کر کے حکومت کو پہنچاتا ہے جب ہم حکومت سے نہیں لڑتے تو کسان کو اپنے زمیندار سے کیوں لڑائیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کس طرح اسمبلی میں جا کر زمینداروں سے کسانوں کے حقوق لئے جا سکتے ہیں۔ یہ ہماری خاص بات ہے۔ اور اسی لئے ہم اپنی ایک مستقل سیاسی پارٹی بناتے ہیں۔ ہم کسان کے حقوق سے دست بردار ہونے والے نہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں روس سے آئی ہوئی ایک تحریک چل رہی ہے۔ اس تحریک میں کام کرنے والے کامریڈ کسان کو زمیندار سے لڑانا چاہتے ہیں۔ ہم بھی چونکہ روس سے ہو کر آئے ہیں، اس لئے ممکن ہے بعض لوگوں کا خیال ہو کہ ہم بھی کسان کو زمیندار سے لڑانے کے داعی ہوں گے۔ ہمارے متعلق یہ سمجھنا ٹھیک نہیں۔

ہمارا پروگرام وقتی نہیں۔ ہم ایک طویل راہ عمل کی طرف بلاتے ہیں۔ آج یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنے طالب علموں کو اپنا سارا پروگرام پڑھا دیں۔ اس وقت ہم آپ کو صرف یہ کہتے ہیں کہ آپ انگریزی پڑھیں تاکہ آج کل یورپ

ہیں جو ہلچل ہے۔ اور وہاں جو انقلاب برپا ہے، اس کے حالات سے آپ براہ راست واقف ہو سکیں۔ ہم عربی طلبا کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے انھیں دیوبند کا نصاب مکمل کرنا چاہیئے۔ وہ اس نصاب کے عقلیات کے حصہ کو بھی ویسا ہی پڑھیں جیسا دینی حصے کو پڑھتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ وہ امام ولی اللہ کی حکمت کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ اس کے علاوہ ہم آپ کو ایک اور مشورہ بھی دیتے ہیں۔ عربی طلبہ کو چاہیئے کہ وہ سندھی فاضل کا نصاب بھی مکمل کریں۔ انھیں سندھی فاضل کا امتحان دینے کی ضرورت نہیں۔ انھیں صرف اس نصاب کے ذریعہ اپنے اندر استعداد پیدا کرنی چاہیئے۔ اس سے یہ ہوگا کہ وہ مولینا محمد قاسم کی بات بآسانی سمجھ سکیں گے۔

آخر میں ہم ایک بات پر زور دیتے ہیں۔ آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ سندھ کی شہری آبادی کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ مگر باہر اطراف اور دیہات میں مسلمانوں کے اشراف خاندان اب تک موجود ہیں۔ ان میں اچھے پیر ہیں۔ اچھے زمیندار ہیں۔ اور نیک علماء بھی ہیں۔ ان لوگوں کے بڑے بڑے خاندان ہیں۔ جن کی گذر زمینداری پر ہے۔ ان میں دینی علوم کی اشاعت کا بڑا میدان ہے۔ ان کو انگریزی زبان سے واقف کرانا بھی اشد ضروری ہے۔ اگر ہمارے نوجوان طلبہ ہمت کر کے یہ کام اپنے کاندھوں پر اٹھائیں تو وہ سندھ میں اسلامیت کو نئی زندگی بخش سکتے ہیں۔ واللہ المستعان

آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ موجودہ سیاسی ہنگاموں سے الگ رہتے ہوئے عربی طلباء کے لئے سیاست سیکھنے کا آسان راستہ کونسا ہے؟ سو اس بارے میں میری رائے یہ ہے

(الف) عربی دان طالب علم کو انگریزی زبان کی تحصیل کرنی چاہئے اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ اردو اور سندھی کو رومن کیریکٹر میں لکھنے پڑھنے کی مشق کرے۔ وہ انگریزی کے حروف سیکھ کر تھوڑی سی محنت اور مطالعہ سے اتنی استعداد بہم کر سکتا ہے کہ اردو اور سندھی کو انگریزی حروف میں لکھ پڑھ سکے۔ اس طالب علم کی حالت ایسی ہوگی جیسے ایک عامی قرآن مجید کو قرأت کے ساتھ پڑھنا سیکھتا ہے۔ وہ گو معنی نہیں جانتا لیکن عربی لفظ کا تلفظ کر سکتا ہے۔ وہ اس حالت میں بآسانی ٹائپ رائٹر کا استعمال سیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ ایک مقرر خواہ اردو میں تقریر کرے اور خواہ سندھی میں، وہ ٹائپ رائٹر کے ذریعہ اس کو انگریزی حروف میں لکھ سکے گا۔ اس کام کیلئے نہ جماعت بندی کی ضرورت ہے اور نہ باقاعدہ کسی استاد سے پڑھنے کی۔ ہر شخص خود ذاتی محنت سے یہ ملکہ حاصل کر سکتا ہے۔

(ب) اس کے بعد انگریزی کی سات کتابیں جو میٹرک تک پڑھائی جاتی ہیں، انھیں "کریما نام حق" کی طرح پڑھے، اور ان کی عبارت کو اپنے ہاتھ سے لکھنے کی مشق کرے۔ اور انگریزی بولنے والوں کی مجلس

پڑھا بیٹھے۔ اور انگریزی الفاظ کا صحیح تلفظ ذہن نشین کرے اور اگر موقعہ ملے تو خود بھی انگریزی بولنے کی مہارت بہم پہنچائے۔ انگریزی کی پانچ کتابیں پڑھنے کے بعد ڈکشنری کی مدد سے وہ انگریزی اخبار کا مطالعہ کرنا شروع کر دے اور جو وقت اس نے انگریزی سیکھنے کے لئے مقرر کیا ہو، اس میں اور کسی چیز کو سیکھنے کی کوشش نہ کرے۔ نہ حساب، نہ سائنس اور نہ جغرافیہ۔ اس دوران میں وہ صرف انگریزی صحیح لکھنے اور بولنے کا خیال رکھے۔ ایک ذہین اور محنتی عربی داں طالب علم چھ ماہ میں یہ کام کر سکتا ہے۔ اور زیادہ مدت درکار ہو تو ایک سال اس کے لئے کافی ہے۔

مثال کے طور پر مولینا ابوالاعلےٰ مودودی کو دیکھئے۔ وہ دینیات کے ایک بڑے فاضل ہیں اور انگریزی بھی جانتے ہیں۔ انہوں نے انگریزی کسی سے نہیں پڑھی، جو کچھ سیکھا ہے انہوں نے اپنی محنت سے سیکھا ہے، اسی طرح سندھ میں سید علی محمد راشدی ایک اچھا نمونہ ہیں۔ وہ معمولی انگریزی جانتے تھے لیکن خود اپنی محنت سے انہوں نے اس میں بڑی ترقی کی ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ طالب علم کو اس ضمن میں امتحان دینے کا خیال دماغ میں نہیں لانا چاہیئے۔ وہ امتحان کا خیال کرے گا تو ایک مہینے کا کام سال بھر کا عرصہ کھا جائے گا۔

عربی داں طالب علم محض سیاسی تربیت کے لئے انگریزی سیکھتا ہے۔ اس کو

کو نوکری نہیں کرنا۔ جس کے لئے اُسے انگریزی ڈگری کی ضرورت ہو۔ یہ طالب علم انگریزی کے ذریعہ جب براہ راست یورپ کی نئی تحریک یعنی روس کے بالشویسٹ پروگرام کی تاریخ اور اس کی کامیابی کے حالات سے واقف ہوگا تو اس وقت جاکر کہیں اس پر یہ حقیقت واضح ہو سکے گی کہ امام ولی اللہ کی حکمت، جس پر کہ ان کی کتابوں "حجۃ اللہ البالغہ" اور ازالۃ الخفا" کا مدار اور اساس ہے۔ اور جس حکمت کے ذریعے وہ قرآن مجید صحاح ستہ اور ائمہ اربعہ کے مذاہب اور محققین علمار کی سیاست کو حل کرتے ہیں۔

وہ ولی اللہی حکمت آج بھی یورپ کی اس انقلابی تحریک سے مقدم اور بلند ہے۔ اور میں جو یہ کہتا ہوں کہ آج کے یورپ کو سمجھے بغیر حضرت امام ولی اللہ کی حکمت کا مرتبہ پہچاننا ناممکن ہے، سو اس کا مطلب بھی یہی ہے۔

اسلامی تاریخ کے پہلے ہزار سال میں ترقی کے کئی راستے تھے۔ اور امام ولی اللہ کے بزرگ بھی ان طرق میں سے ایک طریقہ پر عامل تھے، دوسرے ہزار سال (الف ثانی) میں جس کی ابتدار ہندوستان میں اکبر کی حکومت سے ہوئی، اور امام ربانی مجدد الف ثانی اس تجدید کا اساس رکھنے والے تھے، اس تجدید کی تکمیل کرنے والے امام ولی اللہ دہلوی ہیں۔ اور اس کام کے لئے اللہ تعالیٰ جل وعلیٰ نے صرف ان کو منتخب فرمایا۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی ترقی کے لئے امام ولی اللہ کے

طریقہ کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ہندوستان پر یورپ کی ایک بہت بڑی طاقت کا جبری قبضہ ہے۔ ہم جب تک یورپ کی عام سیاست کو نہ سمجھیں گے، برطانیہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ دوسرے الفاظ میں جب تک آپ برطانیہ کو نہیں سمجھ سکتے، آپ کے لئے ہندوستان کی سیاست کو سمجھنا ناممکن ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر آپ کو اپنے ملک کی سیاست کو جاننا ہے تو برطانیہ کو جانئے۔ اور جب تک آپ یورپ کو نہ جانیں گے آپ برطانیہ کو نہیں جان سکتے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ آپ یورپ کی سیاست کو سمجھیں اور پھر اپنے ملک کی سیاست پر غور کریں۔

امام ولی اللہؒ کے سیاسی فکر اور ان کے بتائے ہوئے راہ عمل کی اصابت اور ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ سلطان محی الدین احمد اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد جب اسلامی سلطنت میں انتشار شروع ہوا، اور اس ملک پر یورپی طاقتوں کے غلبے کی ابتدا ہوئی تو عین اس وقت شاہ صاحب اپنی سیاسی تحریک کی بنیاد رکھتے ہیں۔ وہ اس نئے سیاسی نظام کی ضرورت بھی بتاتے ہیں اور اس کے لئے سائنٹیفک یعنی حکیمانہ اساس بھی وضع کرتے ہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب ہمارے ملک کی سیاسی زندگی کا رشتہ کہیں ٹوٹنے نہیں دیتے۔ اور وہ ایک آزاد ہندوستانی حکومت کی شکست کے ساتھ ہی دوسرے سیاسی نظام کا نعم البدل پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ہیں

کہتا ہوں کہ پہلے تو یورپ کی سیاست کو سمجھو اور پھر امام ولی اللہ کی حکمت کا عمیق مطالعہ کرو۔ اس طرح تم ایک طرف یورپ کو جان لوگے اور دوسری طرف ہندوستان کی سیاست کو سمجھ جاؤگے۔

ہمارا بیت الحکمت اور محمد قاسم ولی اللہ تھیوجیکل کالج امام ولی اللہ کی حکمت کی اشاعت اور اس کی تعلیم کا انتظام کریں گے۔ ہم اپنے نوجوان طلبہ کو بڑی نرمی سے اِدھر متوجہ کرتے ہیں۔ بیشک یہ کام مشکل ضرور ہے۔ مگر ہمارے نوجوان طلبہ خدا کے فضل سے بڑی ہمت کے مالک ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو اپنی ہمت اور قوت سے اس مہم کو باسانی سر کر سکتے ہیں۔

ہم صراحتہً کہتے ہیں کہ ہم برطانیہ سے جنگ وجدل کرنے کا خیال چھوڑ چکے ہیں۔ ہم فی الحال ڈومنین حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سندھ کے عام باشندوں کو ووٹ کی قیمت بتانا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح اسمبلی میں عوام کی طاقت کو مرتکز کرنے میں ساعی ہیں۔

اس کے علاوہ ہمیں یہاں اس بات کی بھی صراحت کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم سندھ میں سندھیوں کی مستقل طور پر حکومت چاہتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں کوئی مذہبی سوال پیدا نہیں ہونے دیں گے۔ ہم سندھ کی سرزمین کو ایک مستقل ملک مانتے ہیں، اور ہم اس براعظم کے بقیہ ملکوں کے ساتھ فیڈریشن کے ذریعہ شریک ہوں گے۔ ہم سارے ہندوستان کو ایک ملک فرض کرکے

اس پر وحدانی (یونیٹری) طرزِ حکومت کے قیام کا بڑی سختی سے انکار کرتے ہیں۔ اگر ہندوستان کو ایک ملک نہ سمجھا جائے۔ اور اس براعظم کا ہر ملک اپنی جگہ آزاد ہو تو اس طرح ہندو مسلم سوال بھی حل ہو جاتا ہے اور پھر ہم برطانیہ کے ساتھ بھی سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔

لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ فکر جو ہم پیش کر رہے ہیں۔ بالکل نیا ہے۔ اس لئے اس کو عمل میں لانے کے لئے ایک مستقل سیاسی پارٹی کی ضرورت ہے۔ یہ پارٹی نیشنل کانگریس کے اندر رہ کر کام کرے گی۔ ہم سندھ میں اس پارٹی کی تشکیل بھی کر چکے ہیں۔ اس پارٹی کے نزدیک قوم سے مراد وہ سیاسی تصور ہے جسے آج یورپ کی سیاست بھی مان رہی ہے۔ وحدتِ زبان اور تمدن و معاشرت کا ایک سا ہونا، یہ اساس ہے قوم کے اس سیاسی تصوّر کا۔ اسی بنا پر ہم سندھیوں کو ایک مستقل قوم مانتے ہیں، اور اسی طرح پنجابی، پشتو، کشمیری، گجراتی، مرہٹی اور ہندوستانی بولنے والوں کو مستقل اقوام کا درجہ دیتے ہیں۔ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ ان تمام قوموں کی انٹرنیشنل زبان اردو اور انگریزی ہوگی۔ وہ علاقے جن میں یہ قومیں آباد ہیں، ان کی حدیں ہمارے شمال میں پشاور تک اور نربدا سے کشمیر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ہم اس سارے رقبہ کو اپنا قومی وطن مانتے ہیں۔ اس رقبہ میں بسنے والی قوموں کے آپس کے تعلقات ایک انٹرنیشنل نظام کے ماتحت ہوں گے۔ ہم اس کے تو حامی ہیں، جیسا کہ

ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ "سندھ سندھیوں کا ہے" لیکن ہمارا یہ اصول اُسوقت ہی قابل عمل ہو سکتا ہے، جب کہ ان سارے علاقوں کو ہمارے اصولوں پر ایک انٹرنیشنل نظام کے تابع کر دیا جائے۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر ہم نے اپنی پارٹی کا نام جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی رکھا ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس سارے علاقے پر ہماری سندھ ساگر پارٹی حکومت کرے کیونکہ ہمارے نزدیک صرف یہی پارٹی صحیح معنوں میں ان علاقوں میں ایک ایسا انٹرنیشنل نظام قائم کر سکتی ہے جس میں ہر قوم آزاد اور ہر ملک اپنی جگہ مستقل ہوگا۔ یہ ہے مختصر لفظوں میں ہمارا نصب العین اور اسی کے لئے ہم سیاسی جد و جہد کر رہے ہیں۔

آگے چل کر اگر بنگال اور دکن ہمارے ساتھ سمجھوتہ کر کے ہماری پارٹی میں شریک ہونا چاہیں گے تو ہم نہایت خوشی سے انھیں قبول کریں گے لیکن اس وقت ہم اپنی تمام طاقت نارتھ ویسٹرن انڈیا کے علاوہ دوسری جگہ صرف کرنا نہیں چاہتے۔

(ج) ہماری یہ پارٹی سندھ کی کسی بھی پارٹی سے جو اس اصول کو اپنا اساس مانتی ہے کہ "سندھ سندھیوں کا ہے" مخاصمت نہیں کرتی۔ بلکہ ایسی پارٹی سے ہم سمجھوتہ کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ سب مل کر ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکیں۔

آخر میں ہم ہر طالب علم کو بڑی تاکید سے وصیت کرتے ہیں کہ جب تک وہ سندھ ساگر پارٹی کے نظریات کو پورے یقین سے نہ مان لے، نہ وہ ان پر عمل کرے، اور نہ دوسروں کو ان کی دعوت دے۔ لیکن اگر کسی درسگاہ کے اساتذہ اور منتظمین اس پارٹی کے نظریات کو مان لیتے ہیں تو ہم انھیں یہ مشورہ دیں گے کہ وہ اپنی تعلیم گاہ کا نام محمد قاسم ولی اللہ تھیو لجیکل کالج رکھیں۔ ہم برابر ان کو اپنے مفید مشوروں سے مدد کرتے رہیں گے۔ واللہ المستعان

خطبہ افتتاح

جمعیت الطلبہ سندھ کے اجتماع میں تقریر فرماتے فرماتے مولانا پر ضعف کی وجہ سے غشی سی طاری ہو گئی تھی لیکن آپ نے فوراً اپنے اوپر قابو پالیا! ور اطمینان سے اپنی تقریر ختم کی۔ بات دراصل یہ تھی کہ مولانا کے جسمانی قوائ اب جواب دے چکے تھے۔ یہ تو صرف ان کے عزم و یقین کی توانائی تھی، جو ان کے زندگی کے رشتہ کو ٹوٹنے نہ دیتی تھی۔ ان دنوں مولانا بے حد مضطرب و بیقرار تھے۔ اور نہیں چاہتے تھے کہ کسی وجہ سے ان کا کام رُکے۔ چنانچہ حیدرآباد کے اجتماع کے بعد اس بیماری و ضعف کی حالت ہی میں وہ ایک رفیق کو لیکر سندھ کے عربی مدارس کے دورہ پر نکل کھڑے ہوئے سفر کی صعوبتوں اور جانکاہیوں کو سہتا صبر و ثبات کا یہ پیکر اطراف سندھ میں مدارس کا معائنہ کرتا، اور نوجوان طلبہ سے برابر ملاقاتیں فرماتا رہا! ور آخر جب صحت کا معاملہ حد سے

گزر گیا، تو رفیق نے بڑی منتوں سے کراچی چلنے پر راضی کیا۔

کراچی میں زیر علاج تھے۔ طبیعت برابر گرتی جارہی تھی اور اکثر بیہوشی کا عالم رہتا تھا۔ لیکن جب ہوش میں آتے تو شہداد کوٹ میں ۴ر اگست کو جس مدرسہ کی رسم افتتاح میں شرکت کا وعدہ کیا تھا اُس کا ذکر فرماتے اور وہاں جانے والی گاڑیوں کے اوقات دریافت کرتے۔ اِسی اثنا میں شہداد کوٹ سے یاد دہانی کے تار آنے لگے تو تیمار دار شاگردوں نے حضرت مولٰنا کو ان کی اطلاع نہ دی کہ کہیں اس حالت ہی میں سفر کا ارادہ نہ فرمالیں۔ ۲ر اگست کا دن تھا۔ اسہال قدرے رک گئے اور طبیعت ذرا سی سنبھلی، آپ نے قلم کاغذ منگوایا۔ یہ تقریر لکھی اور اسے خود ہی چھپوایا۔ اور فوراً ایک طالب علم کے ہاتھ شہداد کوٹ کو روانہ فرما دیا۔

یہ حضرت مولٰنا کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی آخری تقریر ہے جو محمد قاسم ولی اللہ تھیوجیکل اسکول شہداد نگر ضلع لاڑکانہ کے افتتاح کے موقعہ پر پڑھی گئی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ الحمد للہ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ۔ اما بعد:۔
ہم ہند کی گیارہویں ہجری کی تاریخ پڑھانا چاہتے ہیں ۔ مسلمانوں کی تاریخ کا یہ سنہری دور ہے، اس میں چار اولو العزم بادشاہ گذرے جن کی نظیر دنیا میں کم ملتی ہے

(۱) جلال الدین محمد اکبر جس نے نیا شوالہ بنایا اور اس میں نورتن کو بٹھایا۔ اس کے مددگار علمائے دہلی تھے۔ ابو الفضل، فیضی ایک طرف اور خواجہ محمد باقی کی اولاد اور اتباع دوسری طرف۔ اس تحریک کی ابتدا شیخ شہاب الدین سہروردی سے چلی آتی ہے۔ انہوں نے تیمور کو دہلی بھیجا۔ پھر خواجہ عبید اللہ احرار جن کا مولوی جامی اس طرح تعارف کراتے ہیں ؂

جو فقر اندر قبائے شاہی آمد　　بتدبیر عبید اللہی آمد

ان کے اتباع خواجہ محمد باقی کو بلا کر خاص ہدایتوں کے ساتھ دہلی میں متمکن کیا۔ یہ اکبر اعظم کا مرشد تھا۔

(۲) نور الدین جہانگیر۔ وہ نئے شوائے کو مسجد بنانے کی تحریک شروع کرتا ہے۔ وہ ابو الفضل کو قتل کراتا ہے۔ وہ شراب پیتا ہے۔ وہ ہندو مرتاض جوگیوں سے ملتا ہے مگر بخاری ترکوں کا بڑا عالم شیخ عبدالحق محدث دہلوی جہانگیر کا مددگار رہے۔ اس کے اخبار الاخیار اکابر عارفین دہلی کی سوانح عمریاں جمع کرتا ہے اور جہانگیر اسے قبول کرتا ہے۔ اکبر اعظم نے دہلی پر بیرونی سیاسی اثرات ختم کر دیئے تھے۔ جہانگیر نے ہندوستانی دیسی تحریک کو باہر کے اثرات سے مستغنی کرنا شروع کیا۔ باہر سے جو اہل علم آئیں وہ ہندی سوسائٹی میں مندمج ہو جائیں۔ وہ انصاف کو ہندوستانی سلطنت کا معیار بناتا ہے اور اپنے باپ کی جمہوری تحریک کے لئے عوام کی تربیت کراتا ہے۔ آصف جاہ جیسا مدبر اس کا معاون ہے۔

(۳) سلطان شہاب الدین شاہجہاں۔ وہ ہند کی مہذب سوسائٹی کے لئے شاہجہاں آباد بناتا ہے۔ وہ ہند میں نئی زبان، نئی تہذیب۔ ہند کی دینی تعلیمات کا جوہر فقہ حنفی اور طریقہ نقشبندیہ جو امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے منظم کیا جاری کرتا ہے۔ اس نے اپنی اولاد اور اتباع سے اس کی تکمیل کرائی۔ وہ اس تجدید کے ارہاص ہیں۔ شاہجہانی مسجد کو اس کا مرکز بنایا۔ ہمارے لئے شاہجہانی مسجد بیت اللہ اور قدس کے بعد تیسرا دینی مرکز

ہے اس کی تفصیل امام عبدالعزیز دہلوی سے سُنئے گا۔

(۴) سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر۔ انہوں نے ہند کی دینی تحریک کو مسلمان اقوام سے کمزوریاں دور کرنے کیلئے انھیں دہلی کے مرکز سے وابستہ کرنا چاہا۔ اس کے لئے انہوں نے فتاوی عالمگیری لکھایا۔ مسلم سوسائٹی کو غیر مسلم مداخلت سے منزہ کیا۔ پچاس سال ہند میں حکومت کی جو عدل و انصاف کیلئے ایک نمونہ تھا دوسری صدی کے شروع میں سلطان محی الدین عالمگیر نے وفات پائی۔

دہلی میں اس روشنی کے گل ہونے سے جو نتائج پیدا ہوئے۔ اب ہم انکا تعارف کراتے ہیں عالمگیری تحریک بڑی زبردست تھی۔ دہلی کی سوسائٹی اس بوجھ کو نہیں سنبھال سکی۔ محمد شاہ کے زمانہ میں نادر شاہ کے حملہ سے سلطنت کا وقار جاتا رہا۔ امام عبدالعزیز نے ۱۲۳۳ھ سے پہلے دہلی کے دارالحرب ہونے کا حکم دیا جسے مولانا محمد اسمٰعیل شہید نے صراط مستقیم میں اشارۃً لکھا ہے۔ صراط مستقیم میں ہی مولانا عبدالحی لکھتے ہیں "سلطنتِ شاہجہان آباد اسم محض بلا حقیقت است کہ اصلاً معنیٰ از سلطنت نماندہ"۔ اگر آپ چاہیں کہ دوسری صدی میں امام عبدالعزیز نے کس طرح ملت کو بیدار کیا تو صراط مستقیم جو امام عبدالعزیز کے کارندوں نے ملکر لکھی ہے اُسے غور سے پڑھئے کہ کس طرح انہوں نے مہذب پبلک کو بظاہر ڈکٹیٹرشپ اور باندر سے جمہوریت سکھائی ہے۔ جیسے امام ولی اللہ نے پہلے دور کے سلاطین کو جمہوریت مآب بنا دیا تھا۔ ہمارے امام ولی اللہ کی کتابوں کے بعد صراطِ مستقیم ہمارا البرلائزم ہی ہے جو اس میں لکھا گیا۔ الحمد للہ الذی ہدانا لہذا

اس دوران میں نہ کوئی تیموری، عالمگیری ہندی نیشنلزم کو انٹرنیشنل بنا سکا اور نہ کوئی عثمانی اپنی خلافت کو یورپ سے تسلیم کرا سکا۔ اس کے بالمقابل نپولین کے زمانہ سے یورپ نے اپنی نیشنل تہذیب کو انٹرنیشنل بنایا۔ گویا دہلی یورپ سے شکست کھا گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! یورپ اپنے تغلب سے چار تحریکوں کا تعارف کراتا ہے

(۱) لبرل ازم

(۲) انڈسٹری ازم

(۳) ملٹری ازم۔ (۴) آخر میں سوشلزم جس میں مذہب کو قطعاً خارج کر دیا گیا ہے۔ ہم نے اپنے مطالعہ میں جو فیصلہ کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لبرل ازم کو ہم امام عبدالعزیز دہلوی کی صراط مستقیم جانتے ہیں اور انڈسٹری اور ملٹری ازم یورپ کا قبول کرتے ہیں۔ اور سوشلزم میں ہمارے امام ولی اللہ دہلوی ہیں۔ جو فلسفہ اور اکنامکس میں بہت عالی رتبہ ہیں۔ اس لئے امام ولی اللہ کا سوشلزم اسلام پر منطبق ہے۔ اسے مانتے ہوئے ہم اپنی تحریک کو شروع سے آل انڈیا نہیں بتاتے۔ بلکہ دہلی کو اپنا مرکز بنا کر شمال مغربی ہند میں اپنی اقوام کو تربیت دیتے ہیں اور برٹش گورنمنٹ کے ماتحت برٹش کامن ویلتھ میں اچھی پوزیشن حاصل کرنے کے لئے دس بیس سال امن کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اسکول اور کالج ہم اس لئے شروع کرتے

ہیں کہ اپنے نوجوانوں میں سیاسی شعور پیدا کریں۔ واللہ المستعان ولہ الحمد

(ب) اب ہم پھر دہلی کی تاریخ کا ایک ورق یاد دلاتے ہیں۔ جب سلطنت جاری تھی تو عالمگیر کے دور میں ملت کو سنبھالنے والے دو امام پیدا ہوتے ہیں۔ امام ابوالرضا محمد اور امام عبدالرحیم، دونوں بھائی شیخ وجیہہ الدین عمری کی اولاد ہیں۔ اور امام محمد باقی کے تربیت یافتہ بزرگوں کے زیر اثر رہ کر اولوالعزمی آچکی ہے۔ امام عبدالرحیم دہلوی کے صاحبزادے ہیں ہمارے امام الائمہ امام ولی اللہ دہلوی، پہلا دور انہوں نے خود چلایا۔ دوسرا امام عبدالعزیز بن امام ولی اللہ نے چلایا۔ یہ ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ میں بالاکوٹ میں ختم ہو گیا۔ امام عبدالعزیز کے بعد امام محمد اسحٰق و محمد یعقوب نے تحریک کو آگے بڑھایا، مگر کمزوری نہ گئی۔ تو اسے عثمانی سلطنت سے ملا دیا۔ بڑی جنگ میں ترکی کی شکست اور خلافت کے خاتمہ پر یہ پروگرام بھی شکست کھا گیا حفیدین۔ نے یہ کام دہلی کی ایک دوسری صدیقی جماعت کے سپرد کیا جو امام امداد اللہ کے ماتحت مولانا محمد قاسم کی رہنمائی میں کام کرتی رہی۔ آخری شکست سے پہلے ہی دہلی کے مفتوح ہونے پر یہ تحریک منتشر ہو کر دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ (۱) علی گڑھ پارٹی کو ایسپریٹ۔ سر سید اس کے لیڈر تھے (۲) دیوبند پارٹی نان کو ایسپریٹر مولانا محمد قاسم اور پھر مولانا شیخ الہند محمود حسن دیوبندی اس کے حامل تھے۔ اب یہ سکیم بھی فیل ہو گئی تو مولانا شیخ الہند چند اشارات مستقبل

کے لئے دے گئے ہیں۔ میں اپنی ذمہ داری پر تحریک کا تیسرا دور چلانا چاہتا ہوں۔ واللہ المستعان ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم نے دہلی کی تاریخ پڑھانے کے لئے محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج محمود نگر برائے یادگار شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قائم کیا ہے۔ اس سارے ادارہ کا نام سندھ ساگر انسٹی ٹیوٹ رکھا ہے یاد رکھنا چاہیئے۔ سندھ ساگر انسٹی ٹیوٹ اپنے تین مرکز بنائے گی۔

(۱) بیت الحکمت جو محمد قاسم ولی اللہ کالج کا جزو بن جائے گا۔

(۲) سندھ ساگر اکاڈمی جو کالج کے لئے (الف) نشر و اشاعت (ب) طالب علموں کا جمع کرنا (ج) فارغ طالب علموں کی تنظیم یہ دونوں مرکز خالص علمی ہیں۔

(۳) جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی یہ خالص سیاسی جماعت ہے۔ اس کی تعلیمات دی جائیں گی مگر پارٹی بنائی نہیں جائے گی۔ اگر اسمبلی کے اندر انسٹی ٹیوٹ کا اجمالی تعارف ہو گیا۔ اس کی مدد کے لئے محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل اسکول شہداد نگر میں مولانا غلام مصطفےٰ اور اس کے رفیق قاضی عزیز اللہ کی ہمت سے کھولا جاتا ہے۔ ہم اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ کالج تحریک سندھی نوجوانوں میں پہنچ گئی۔ والحمد للہ علی ذالک۔

پارٹی کے نام میں ایک قسم کا اشکال محسوس ہوتا ہے اسے یوں سمجھنا:

چاہئے کہ نربدا سندھ ساگر کا ذکر تو شمال مغربی ہند کی تجدید کے لئے ہے اور جمنا کے کنارے پر آگرہ میں اکبر اعظم اور دہلی میں شاہجہانی تحریک پھلی پھولی، وہ ہمارے قومی اساس کا سامان ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر اس تحریک کو شروع کرتے ہیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین، وصلی اللہ علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ وجمیع الصالحین اجمعین۔

۱۲؍شعبان ۱۳۶۳ھ
۲؍اگست ۱۹۴۴ء ہندی

مقالات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ومن یتوکل علے اللہ فہو حسبہٗ

کھول کر آنکھیں میرے آئینۂ گفتار میں آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ (اقبال)

جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی

کا

اساسی پروگرام

اِنّ ولیّیَ اللہُ الذی نزّل الکتابَ وھُوَ یتولّ الصّٰلحین ط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علی سیدنا محمد سید المرسلین وخاتم النبیین وعلی آلہ واصحٰبہ واتباعہ من ائمۃ الدین وعباد اللہ الصالحین وبارک وسلم

اما بعد۔ آج ہم نے خدا کا نام لے کر اسی کی مدد پر اعتماد کرکے شمال مغربی ہند کی "نئی سیاسی جماعت" جمنا، نربدا، سندھ، ساگر پارٹی کے پہلے حصہ کا کام سندھ میں شروع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

پارٹی کے چند اساسی قواعد ہم نے ضبط کرلئے ہیں تاکہ خواص کو دعوت دینے میں آسانی ہو۔ ان میں اکثر وہی باتیں ہیں جو سیاسی مطالعہ کرنیوالوں

کے نزدیک علوم متعارفہ کا حکم رکھتی ہیں۔ اسلئے انکی مزید تشریح کی اس مقدمہ میں ضرورت نہیں۔ البتہ پارٹی کے میدان عمل کو محدود کرنے کا مسئلہ قابل ایضاح ہے۔

جس مبتصر کو گذشتہ تیس برس کی تاریخ پیش نظر ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ ہندستان کا سیاسی تقدم اتنا مشکل نہیں جیسا کہ اس سے پہلے سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ امر بھی ساتھ ہی منکشف ہوجاتا ہے کہ یہ کھیل جب کبھی بن کر بگڑتا ہے تو اس کی تہ میں ہندو مسلم اختلاف ہی باعث نقصان نظر آتا ہے۔

اس اختلاف کو حل کرنے کے لئے متفرق طور پر سیاسی نظریات بنائے گئے مگر عملاً "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کا منظر سامنے نظر آتا ہے۔

ہم نے عملی اشتراک کے ساتھ فکری اتحاد کا ضمیمہ بھی لگادیا ہے۔ اس طرح ایک نیا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے ہم نے ایک ایسا قطعہ انتخاب کیا ہے۔ جو دونوں تہذیبوں کا مرکز ہے۔

جس طرح گنگا جمنا کا دوآبہ ہندو تہذیب کا منبع ہے۔ اسی طرح سندھ ساگر مسلم تہذیب کا معدن ہے۔ اگر ہم ان دو عظیم الشان قطعات کا اپنے نظریہ پر سمجھوتہ کرا سکے۔ ان کی تالیف قلوب پر قادر ہو سکے۔ تو اس لاینحل مشکل کی کلید مل جائے گی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اسکندریہ میں حکماء کا ایک طائفہ نیوفلاطونی پیدا ہوا تھا۔ اسی منہاج پر مسلمانوں میں کئی حکیم پیدا ہوئے، جنمیں کا الشیخ الاکبر محی الدین

ابن عربی اور شیخ الاشراق شیخ شہاب الدین السہروردی مشہور عالم ہیں۔
ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی کے زمانہ سے صوفیہ کرام کی آمد شروع ہوئی۔ سلطان شہاب الدین غوری کے بعد اس خاک سے تصوف کے چاروں طریقوں میں کثرت سے معرفت الٰہی میں کامل خادم انسانیت پیدا ہوئے، وہ سب اسی حکمت اشراقی کے امام تھے۔ مگر ایسا عالم جو اپنے انکشافات اور نظریات کی تدوین و تنظیم پر قادر ہو۔ امام ولی اللہ دہلوی جیسا پیدا نہیں ہوا۔

ان تمام ائمہ تصوف کا مرکزی فکر وحدت الوجود ہے۔ جو ویدانت فلاسفی کا اصل اصول ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اسی کی تہذیب و تکمیل سے انسانیت کی تشریح کی اور اُسے کتاب و سنت کا بطن بنایا۔ جیساکہ ان کی معرکتہ الآراء کتاب حجۃ اللہ البالغہ اور ان کی فلسفی تصانیف البدور البازغہ اور التفہیمات الالٰہیہ وغیرہ سے واضح ہوتا ہے۔

ہمارے خیال میں اگر دونوں مذاہب کے خدام انسانیت اسی فلاسفی کو امام بناکر تقدم کی جد و جہد میں مصروف ہو جائیں تو ہند ایک دفعہ پھر مجمع البحرین بن کر دنیا کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

ہمارے پرانے رفقاء میں سے اگر کوئی بزرگ ہمارا نیا انداز دیکھ کر چیں بجبیں ہوں تو اُن کی خدمت میں مختصر اًعرض ہے۔ ؎ کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو
فقط ہمارا اصلی مخاطب ہندوستانی نوجوان ہے ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانانِ سعادت مند پند پیرِ دانا را

جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی کا پروگرام

(۱) دار الرشاد، السواد الاعظم، قاسم المعارف کے پرانے کارکن اور اُن کے رفقاء، جو وطنی خدمت کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں۔ انڈین نیشنل کانگرس کے اندر ایک مستقل پارٹی تشکیل کرتے ہیں۔ جسے شمالی مغربی ہند کے محدود رقبہ جات سے تعلق ہوگا۔

(ا) پارٹی کا نام جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی ہوگا۔

(ب) اس پارٹی کا میدانِ عمل چار حصوں میں منقسم ہوگا۔

(۱) آج کا صوبہ سندھ جس کا مرکز کراچی ہے

(۲) دریائے سندھ اور اس کے معاونین کی زمین جس کا مرکز لاہور ہے

(۳) دوآبہ گنگا جمنا اور اس کا زیر اثر اجمیری بنارسی علاقہ جس کا مرکز دہلی ہے

(۴) ہند کا ایسا حصہ جو اپنے فیصلہ سے پارٹی میں شامل ہو۔

(۲) اس پارٹی کے نظری اساسی اصول یہ ہیں۔
(ا) عدم تشدد کی پابندی سے کامل آزادی حاصل کرنا۔
اس تاریخی حقیقت کو یاد رکھنا چاہیئے کہ مسیحیت نے عدم تشدد کی پابندی سے تین سو برس میں استقلال حاصل کیا تھا۔
(ب) کاشتکار اور دستکار محنت کش کی معاشی حالت درست کرنا اور اسے ترقی دے کر یورپ کے محنت کش کے برابر بنانا۔
جب تک ملک کی عام آبادی کی معاشی حالت ترقی نہ کرے سیاسی ترقی ناممکن ہے۔
(ج) ہند کو ایک ملک نہیں بلکہ یورپ کی طرح مجموعہ ممالک ماننا۔ زبان اور معاشرت کو ملکی تقسیم کا اساس بنانا۔
(د) ہر ایک ہندوستانی ملک (یعنی جس میں ایک زبان بولی جاتی ہے۔ اور اس کی معاشرت میں تقریباً ایکسانی ہے اس میں مستقل رہائش رکھنے والے ہر مرد اور عورت کا مساوی حق ماننا اور جمہوری نظام پر قومیت کو ترقی دینا۔ نسل، مذہب اور قدامت کو تفوق کا ذریعہ نہ بنانا۔
(ہ) ایک ہندوستانی ملک کی عام آبادی کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دے کر ووٹ کی قیمت سمجھانا۔ (تشریح)
جو ہندوستانی زبانیں عربی حروف میں لکھی جاتی ہیں۔ ان کی تعمیم تعلیم موجودہ

رسم الخط کے ذریعہ سے نہایت دشوار ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ یا تو حروف علیحدہ علیحدہ لکھنے کا رواج دیا جائے یا رومن حروف میں لکھنا شروع کریں۔ دوسری صورت میں ٹائپ رائٹر سے بآسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہم چونکہ جبری قوت استعمال نہیں کر سکتے۔ اس لئے سمجھا بجھا کر بالتدریج کامیابی حاصل کریں گے۔

(د) ترقی یافتہ یورپ کی صنائع کو اپنے ملک میں پیدا کرنے کے لئے اور وطن کی خدمت اور حفاظت میں مرد و عورت کو جوانمردی سکھلانے کے لئے یوروپین معاشرت اختیار کرنا۔

(تشریح) یوروپین قوموں کی سیاسی برادری میں شامل ہوئے بغیر نہ تو ایشیا کی سیاسی ترقی آسان ہے نہ ہندوستان کی۔ اس لئے معاشرتی انقلاب خوشی سے برداشت کر لینا چاہئیے۔ ورنہ ارتجاعی قوتیں ملک کو خاک سیاہ بنا دیں گی۔

(ز) فکر اور اخلاق اور سیاست میں یکسانی پیدا کرنے کے لئے امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت اور فلسفہ کو پارٹی کا عقلی اساس ماننا۔ اور اس راستہ سے انسانیت کی خدمت کے لئے تیار کرنا۔

(تشریح) دوسری ہزار ہجری کے ابتداء سے یعنی جلال الدین اکبر کے زمانہ سے مسلمانانِ ہند کے مفکرین کا ایک طبقہ ابن عربی کے فلسفہ یا ویدانت فلاسفی کی اصلاح اور تکمیل میں اس لئے مصروف رہا کہ اسے ہندوستانی زندگی کا عمومی

سیاسی اساس بنائے، امام ولی اللہ دہلوی کا فلسفہ ان تمام مساعی کا نچوڑ ہے۔ اس سے تمام ادیان میں تطبیق دی جا سکتی ہے۔ اور انسانیت کی ارتقائی تاریخ کی تشریح ہو سکتی ہے۔

(ح) ہندوستان کی وحدت کو فیڈریشن میں منحصر سمجھنا۔

ہندوستان کو ایک ملک سمجھنا اسی قدر غلط ہے، جیسے کوئی روس کو نکال کر باقی یورپ کو ایک ملک کہا کرے۔

(ط) فیڈریشن کی تکمیل کے لئے ایک کافی لمبی مدت تک برٹش کامن ویلتھ میں رہنے کا فیصلہ کرنا۔

(ی) فیڈریشن کی زبان ترقی یافتہ ہندوستانی (اردو) اور انگریزی کو بنانا۔

(تشریح) اردو کو رومن حروف میں لکھ کر یورپین قوموں میں رواج دینا اور مقطع حروف میں لکھ کر ایشیائی قوموں میں پہنچانا اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔

(۳) پارٹی کے عملی سیاسی اصول یہ ہیں۔

(۱) پارٹی اپنے نظریات کو پھیلانے کے لئے خاص تعلیم گاہوں میں خدام خلق تیار کرے گی۔ فقط وہی لوگ پارٹی کے ممبر بن سکیں گے جو انسانیت کی خدمت کو اپنا فرض قرار دیں گے۔ اور عدم تشدد کی پابندی سے اس فرض کی تعمیل میں ہر قسم کی مشقت برداشت کرنے کا عہد کریں گے کہ وہ

تکلیف دینے والوں پر کسی صورت میں ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔

(ب) پارٹی کے جس قدر ممبر حکومت میں شریک ہوں گے۔ وہ اپنی کرسی پر ملک کے ہر فرد کے ساتھ یکساں معاملہ کریں گے۔ اور رشوت لینا بند کرائیں گے۔

(ج) پارٹی کے تجارت پیشہ ممبر ماپ اور تول میں کمی بیشی نہیں کریں گے۔ حساب لکھنے میں خیانت نہیں کریں گے۔ ربا بند کرائیں گے۔

(د) پارٹی کے زمیندار ممبر کاشتکار سے جو معاہدہ کریں گے۔ اس کے پابند رہیں گے۔ کاشتکار کے خاندان کی بڑھتی ہوئی ضروریات زندگی بہم پہنچانے میں پوری مدد دیں گے۔

(ہ) پارٹی کے کاشتکار ممبر حکومت کا مقررہ خراج اور زمیندار کا حصہ معاہدہ کی پابندی سے پورا کریں گے۔

(و) پارٹی کے کاشتکار ممبر جس سے معاملہ کریں گے، امانت کو اپنا شعار بنائیں گے۔

(ز) پارٹی کے جس قدر ممبر علمی یا اخلاقی خدمت کرنے کے لئے مخصوص ہیں، وہ اپنے ملک سے جہالت دور کرنے میں انتہائی جدوجہد کریں گے۔ وہ ادنیٰ ضروریات زندگی پر اکتفا کریں گے۔

(ح) پارٹی کے ہر علمی ممبر کا فرض ہوگا کہ وہ ہر مرد و عورت کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔

(۱) اپنی ملکی زبان میں۔

(۲) اپنی بین الاقوامی زبان میں۔

(۳) ہر پابند مذہب کو اس کی ملکی زبان میں۔

(ط) پارٹی کے ہر اس ممبر کا جو اخلاقی استاد یا مرشد مانا جاتا ہے، فرض ہوگا کہ وہ اپنے ملکی بھائیوں کو حقوق کا احترام سکھلائیں۔ یہاں تک کہ ان کے مُلک کا ہر شخص کسی انسان کے جان و مال، عزت کو نقصان پہنچانا اخلاقاً حرام سمجھے۔

(ی) پارٹی کا ہر ممبر اپنی ضروریات زندگی خود کما کر حاصل کرے گا۔ اس کا فرض ہوگا۔ کہ ملک سے بیکاری کی زندگی کو ختم کردے۔ ہر امیر و غریب کو کسی نہ کسی طریقے سے محنت کش بنایا جائے۔ وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین!

دار الرشاد سندھ ساگر

۱۰ دسمبر ۱۹۳۹ء ہندی

جمعیت خدام الحکمت

اِنَّ وَلِیِّیَ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتَابَ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ ؕ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ رب العلمین والعاقبۃ للمتقین وصلی اللہ وسلم وبارک علی سیدنا محمد سید المرسلین وخاتم النبیین وعلی اخوانہ من الانبیاء والمرسلین وعلی الہ واتباعہ من ائمۃ الدین وعباد اللہ الصلحین اجمعین!

اما بعد:- آج بروز یکشنبہ ۱۲ ذی القعدہ الحرام ۱۳۵۸ھ (۲۴ دسمبر ۱۹۳۹ھ ہندی) دار الرشاد میں (اور ۱۶ ذیقعدہ کو مظہر العلوم کراچی میں) جمعیۃ العلماء کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا جاتا ہے۔ جو اسلامی فلاسفی کا خادم اور محافظ ہوگا۔ اگر خدا کو منظور ہے تو وہ ایک سوچے سمجھے ہوئے دینی پروگرام پر چل کر مسلمانوں کا تشتت دور کردے گا۔ واللہ الموفق والمعین!

جمعیۃ خدام الحکمۃ کے اصول

(۱) جمنا زبدا سندھ ساگر پارٹی کے اراکین میں سے دارالرشاد کے علماء اور ان کے ساتھ مظہر العلوم کراچی کے علماء، جمعیۃ العلماء سندھ میں ایک مستقل شعبہ کی تاسیس کرتے ہیں، جس کا نام جمعیۃ خدام الحکمۃ ہوگا۔

(۲) خدام الحکمۃ کے اساسی اصول نظری و عملی حسب ذیل ہوں گے۔

(ا) امام ولی اللہ دہلوی (حکیم الہند) کو جمیع علوم شرعیہ مثلاً کتاب و سُنت و حکمت و سیاست میں سنہ ۱۱۴۴ھ ہجری (۱۷۳۱ھ ہندی) سے امام الہند تسلیم کرنا۔

(ب) ان کی کتابیں (۱) فوز الکبیر۔ فتح الرحمٰن۔ ازالۃ الخفاء (۲) حجۃ اللہ البالغہ۔ مسوی۔ مصفیٰ (۳) قول جمیل۔ الطاف القدس۔ ہمعات (۴) سطعات۔ لمعات۔ البدور البازغہ۔ الخیر الکثیر۔ تاویل الاحادیث (۵) فیوض الحرمین۔ التفہیمات الالٰہیہ وغیرہ ان کی اصلی زبانوں میں پڑھنے پڑھانے کو مقصد حیات بنانا۔

(ج) امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کی تشریح میں امام عبدالعزیز دہلوی کو امام ماننا اور مولانا رفیع الدین کی تکمیل الاذہان، مولانا محمد اسمٰعیل شہید کی عبقات، مولانا محمد قاسم دیوبندی کی تقریر دلپذیر اور شرح

حدیث ابی رزین اور "قبلہ نما" کو بطور مبادی پڑھنا پڑھانا۔

(د) ہندی سیاست کو ترقی دینے کے لئے سندھ ساگر پارٹی یا اسی منہاج کی مستقل پارٹی کو انڈین نیشنل کانگریس میں قائم رکھنا اور مولانا محمود حسن دیوبندی شیخ الہند کو اس سلسلہ کا استاد ماننا۔

(ہ) ج، ن۔ سندھ ساگر پارٹی کے مراکز سیاسیہ مثل دہلی، لاہور، کراچی اور مراکز علمیہ مثل دارالرشاد، مظہر العلوم۔ دارالعلوم دیوبند میں جمعیۃ خدام الحکمۃ کے مراکز ہوں گے۔

(و) دارالرشاد کے مرکز میں جمعیۃ خدام الحکمۃ کی صدارت جناب پیر صاحب صاحب العلم دامت برکاتہم اور مظہر العلوم میں اس شعبہ کی صدارت جناب مہتمم صاحب زید مجدہم اور دارالعلوم دیوبند میں جناب مہتمم صاحب زید مجدہم کریں گے

(ز) اس جمعیۃ خدام الحکمۃ کے محل اور مقام کو بیت الحکمۃ کہا جائیگا۔

(ح) بیت الحکمۃ میں قرآن عظیم کی حکیمانہ تفسیر پڑھائی جائے گی۔

(ط) بیت الحکمۃ میں فقط امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی تعلیم ہو سکتی ہے۔

(ی) بیت الحکمۃ میں ایسا کتب خانہ جمع کیا جائے گا جس کی مدد سے امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کا حکماء ہند اور حکماء یورپ سے مقابلہ کیا جا سکے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

قومی اجتماعِ ہند

نیشنل ہے یا انٹرنیشنل؟

نیشنل کانگریس جب شروع کی گئی تھی۔ تو اس کا مقصد یہ قرار دیا گیا تھا کہ اینگلو انڈین طبقہ کے ساتھ انگریزی بولنے والے ہندوستانی مل کر ایک نئی قومیت کی بنیاد قائم کریں گے جو انگریزوں سے سوشل ارتباط میں وابستہ رہے گی۔ تاکہ برٹش گورنمنٹ کے لئے ایک قابلِ اعتبار سوسائٹی تیار ہوتی رہے۔ اس طرح جب کبھی ہندوستانی مطالبات سے مجبور ہو کر حقوق بخشی کی ضرورت ہو گی تو اسی سوسائٹی کو ہندوستان کا قائم مقام مانا جائے گا۔ برٹش کامن ویلتھ کے حالات دیکھنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس قسم کی پالیسی برطانیہ کے اصولِ سلطنت میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔

مؤسسین کانگریس کا اصلی نصب العین تو جبھی پورا ہو سکتا تھا۔ اگر اینگلو انڈین اس اجتماع پر حاکم رہتے۔ مگر بنگالی نیشنلسٹ نے ہندوستان کی نمائندگی میں اس

طرح بیش قدمی شروع کردی، جس کا مقابلہ اینگلو انڈین نہیں کر سکے۔ اس کے بعد اسی سلسلے میں احاطہ بنگال و بمبئی کے نیشنلسٹ آگے بڑھتے گئے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس قدر ان میں ہندوستانیت زیادہ آتی گئی، اسی قدر گورنمنٹ کانگریس کو ناپسند کرنے لگی۔

ہم اس دوسرے دور کو تنسیخ تقسیم بنگال تک ممتد مانتے ہیں۔ اس زمانہ تک دہلی اور اسکے متعلق شمالی مغربی ہند نے کانگریس میں زیادہ ہمت سے حصہ نہیں لیا۔ اور اس کا سبب واضح ہے کہ یو پی اور پنجاب انگریزدانی میں کلکتہ، مدراس اور بمبئی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

حرب عمومی کے خاتمہ پر مہاتما گاندھی کانگریس میں نمودار ہوئے۔ اسے ہم تیسرے دور کا عروج سمجھتے ہیں۔ اس زمانہ سے کچھ عرصہ پہلے میں نے کانگریس کی خدمت شروع کی تھی اگرچہ اس وقت میں ہندوستان میں نہیں تھا میری خدمات کا اندازہ لگانے سے پہلے یہ خیال ہمیشہ مستحضر رکھنا چاہیئے کہ وطن چھوڑنے کے بعد میرے لئے قدرتی اسباب پیدا ہو گئے تھے کہ میں یورپ کی انٹی برٹش طاقتوں کے سوا اور کسی سے تعلق رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

روس کو اگر یورپ سے علیحدہ کر دیا جائے تو ہمارا ہندوستان رقبہ اور آبادی اور تنوع لغات وغیرہ حیثیتوں سے اس چھوٹے یورپ سے متناسب ہے۔ اس لئے

حقائق اور واقعات کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ مگر ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس سے ہمارا اور یورپ کا طریق تعبیر مختلف نظر آتا ہے۔ اس لفظی اختلاف نے حقیقت کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ میں ناظرین کو اس مسئلہ پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

آج کل یورپ کی علمی مجالس میں لفظ قوم کی تعریف اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ نیشن وہ انسانی اجتماع ہے جو ایک زبان بولتا ہو۔ اور ان کی معاشرت میں ایک حد تک یکسانیت پائی جائے۔ چونکہ اس آبادی میں ایک فکر جلدی شائع ہو سکتا ہے اور رد و بدل کا تداول بھی بآسانی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اسے ایک وحدت ماننا ضروری ہے۔

میرے خیال میں اس اصطلاح پر تمام ہندوستانی ایک قوم نہیں مانے جا سکتے بلکہ سندھی۔ کشمیری۔ بنگالی۔ مرہٹی علیحدہ علیحدہ قومیں کہلائیں گی۔ مجھے اثنائے قیام مکہ معظمہ میں بارہا تجربہ ہوا کہ ایک بنگالی حاجی کی مدد کرنے میں عاجز آیا کیونکہ وہ میری زبان نہیں سمجھتا تھا۔ میرے خیال میں جس طرح یورپ میں انگریز، فرانسیسی۔ جرمن۔ اطالین قومیں مانی جاتی ہیں، وہی کیفیت ہمارے ہندوستان میں بھی موجود ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مختلف زبانیں بولنے والی قومیں اگر سمندر، پہاڑ جیسی قدرتی حدود انھیں جدا نہیں کرتیں تو آپس میں کسی نہ کسی طرح اشتراک فکر پیدا کرنے کے لئے مجبور رہیں۔ یہ فلسفی فکر کبھی تو الہیات سے تعلق رکھتا ہے

جیسے عقیدۂ "وحدۃ الوجود" اور کبھی اقتصادیات سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسے ہمارے زمانے میں اشتراکیت۔ اور کبھی ایک دینی تنظیم میں دونوں باتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے فکری اتحاد سے جو وحدت پیدا ہو۔ اسے انٹرنیشنل طاقت کا اساس ماننا چاہیئے۔ اس قسم کے اشتراک سے اس بیسویں صدی کی عام اصطلاح کے موافق ایک قوم ہرگز نہیں بن سکتی۔ یہ امر بھی قابلِ لحاظ رہے کہ ہم اسے بھی ممکن نہیں سمجھتے کہ کسی غیر معمولی تاثیر سے کوئی خاص زبان ہندوستان کے رہنے والوں کو اس تعمیم سے سکھلائی جائے۔ جس سے آگے چل کر آج کی اصطلاح میں، قومیت پیدا ہو جائے۔

ہندوستان کی تاریخ میں ہندو فلاسفی نے شمالی ہند کو مرکز بنایا۔ اور دکن کو فتح کر لیا۔ اس طرح ویدک زمانے میں اور اس کے بعد بودھوں کی حکومت میں اس فکری اتحاد نے سارے ہندوستان کو ایک رسی سے باندھ کر اسے ایک انٹرنیشنل طاقت کو ضرور بنا دیا۔ مگر ہم اسے نیشنل طاقت نہیں کہہ سکتے۔

دیکھیئے ہندو فلاسفی نے اسی مرکز سے اکثر ایشیائی ممالک کو فتح کیا۔ بلکہ یونان کے توسط سے یورپ پر بھی غلبہ حاصل کیا۔ آج بھی یوروپین طاقتیں اس کا لوہا مانتی ہیں۔ تو کسی علمی اصطلاح میں بھی ان ممالک کو کیا نیشنل طاقت سے تعبیر

کرنا ممکن ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اسلامی دور میں بھی ہندوستان کے انٹرنیشنل ازم کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ اس کے بعد اب انگریزی دور بھی اس کا تتبع کر رہا ہے اس لئے اپنے ملک کے اربابِ فکر سے ہماری پُر زور التماس ہے کہ وہ اس مسئلہ پر توجہ کر کے اس علمی غلطی کی تصحیح کریں۔

ہمیں معلوم ہے کہ ترکوں میں بعض سیاسی لیڈر ایسے پیدا ہوئے۔ جو اتحادِ اسلام کو بھی ایک نیشنل تحریک مانتے ہیں اور اسے اسلامی قومیت کا نام دیتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے تتبع میں ہی اسلامی قومیت کی اصطلاح نوجوان مسلمانوں نے ہندوستان میں بھی استعمال کرنا شروع کر دی ہے۔

جہاں تک ہم ترکی عملداری پر غور کر سکے، ہمیں صاف نظر آیا کہ ترکی قومی تحریک کے لئے یہ ایک خاص قسم کا پروپیگنڈا تھا ترک چونکہ اس تحریک کو اُسکے مرکز پر قبضہ کر کے چلا رہے تھے، ان کے لئے تو یہی موزوں تھا کہ دوسری اسلامی قوموں کی قومیت کا اعتراف نہ کیا جائے اور اسی غلو کا یہ نتیجہ نکلا کہ عرب ترکوں کے قومی مخالف بن گئے۔

اسی قیاس پر ہمارا خیال ہے کہ غالباً ہندو سوسائٹی نے بھی اپنے سیاسی تغلب کے زمانے میں ہندوستان کی باقی اقوام کا اعتراف چھوڑ دیا ہوگا۔

ہماری التماس ہے کہ ہندوستانی مسئلہ آج کی حیثیت پر غور کرکے اس ڈپلومیٹک اصطلاح کو چھوڑ دیں۔ اس سے ان کے پروگرام میں کوئی بڑا انقلاب رونما نہیں ہوگا۔ مثلاً بنگال کانگریس کمیٹی کا نام اگر بنگال نیشنل کانگریس کردیا جائے تو بنگال کی ذہنیت سے زیادہ چسپاں ہوگا۔ اسی طرح مہاراشٹر گجرات سندھ۔ پنجاب کی ان قومی جماعتوں کو نیشنل کانگریس سے تعبیر کیا جائے۔ اس کے بعد آج کی آل انڈیا نیشنل کانگریس صحیح معنی میں آل انڈیا انٹرنیشنل کانگریس بن جائے گی اور فیڈریٹ انڈیا سے زیادہ مناسبت پیدا کرے گی۔

فیڈریشن کی موجودہ اسکیم میں ہزار نقص نکالے جائیں۔ اور اس کی اصلاح کے مختلف طریقے زیر غور ہوں۔ اسے ہمارے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اصل فیڈریشن کا متفق علیہ ہونا ہی ہمارے نظریہ کو ثابت کرتا ہے۔ آج کی حالت یہ ہے کہ اولاً برٹش پارلیمنٹ نے اس کے بعد ہند کی تمام سیاسی جماعتوں نے اصل فیڈریشن کو تسلیم کرلیا ہے۔ بحث فقط تفصیلات میں ہے۔ کیا کانگریس کے لئے اس لفظی اصلاح پر غور کرنے کا وقت نہیں آیا۔

ہم کیا چاہتے ہیں

ہم سیاسیات ہند میں ایک نئی جماعت (پارٹی) پیدا کرنا چاہتے ہیں، جس کا ڈھانچہ ہم نے جمنا، نربدا، سندھ، ساگر پارٹی کے نام سے تیار کرنا شروع کیا ہے۔ آج ہم اس پارٹی کے مقاصد پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ پارٹی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور اس کی طاقت کا منبع کیا ہوگا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانانِ ہند کی اندرونی طاقت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک کا مرکز علی گڑھ بنا اور دوسری کا مرکز دیوبند قرار پایا۔ علی گڑھ نے مسلم لیگ پیدا کی اور یہ اسکی سیاست کی آئینہ دار ہے۔ دیوبند نے جمعیۃ العلماء ہند پیدا کی اور اسکی سیاست اس جماعت کی شکل میں پڑھی جا سکتی ہے۔ اب یہ دونوں تحریکیں رک گئی ہیں اور مسلمانوں کی کشتی ساحلِ مراد تک نہیں پہنچا سکیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ مسلم لیگ میں مفکرین کا ایک اچھا خاصہ طبقہ موجود ہے جو

اسکے پروگرام سے مطمئن نہیں مگر وہ اپنی بعض ضرورتوں کی وجہ سے مجبور ہو کر لیگ کے ساتھ گھسٹتا اور لڑھکتا چلا جارہا ہے۔ ایسے ہی ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ جمعیتہ العلماء ہند کے بہت سے علماء جمعیتہ کے پروگرام سے مایوس ہو چکے ہیں ہم ان روشن خیال پریشان دماغ طاقتوں کے سامنے اپنا پروگرام پیش کرنا چاہتے ہیں ہیگا

پروگرام کا اہم جزو ہمارے پروگرام کا سب سے اہم جزو یہ ہے کہ ہم سیاسیات ہند میں اپنا حصہ اپنے قبضے میں لانا چاہتے ہیں اور ابھی سے اس کی تیاری کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں بیرونی مسلمانوں کی کسی قسم کی امداد کی قطعاً کوئی توقع نہیں ہے، یہانتک کہ اگر کوئی بیرونی طاقت ہندوستان پر حملہ آور ہو تو خواہ وہ مسلم ہی کیوں نہ ہو، ہم اس کا اپنی پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کریں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کسی مسلمان طاقت کا بھی یہ حق نہیں ہے کہ ہماری موجودگی میں وہ اسلام کے نام پر ہندوستان کی سرزمین کو پامال کرنیکی کوشش کرے۔ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ کیا ہمیں اپنے وطن میں حکومت قائم کرنے کا حق نہیں ہے؟ اس میں شک نہیں کہ بیرونی مسلم ممالک کو اپنی حکومتوں کو مستحکم اور منظم کرنے کا حق حاصل ہے۔ مگر ہم ان کے اس حق کو ہرگز قبول نہیں کر سکتے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کر کے اسے فتح کرنے کی کوشش کریں۔

یہ ہمارا حق ہے کہ ہم ہندوستان میں ہندوستانی حکومت قائم کریں۔

اس فکر پر ہم کافی روشنی ڈال سکتے ہیں اور اس طرح اپنی سوڈیڑھ سو سال کی سیاسی

غنودگی دُور کر سکتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمان اور اسلامی ممالک

لیکن یہاں ہمیں یہ بحث کرنا مقصود نہیں ہے، اس لئے صرف ایک اشارہ کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔

سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں جب شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت دلّی کی کمزوریوں کو دُور کرنے کے لئے اٹھی تو اس کو کسی مسلم سلطنت نے مدد نہیں دی۔ جب ہمارے اسلاف اپنے ملک میں اپنی حکومت پیدا کرنے کیلئے شہید ہو چکے ہیں تو ہم اس تخیل بلند کے سوا کسی چیز کو اپنے سامنے نہیں آنے دیں گے۔

ہمارے ہندوستانی رہنما تو عرصے سے کہہ رہے ہیں کہ ع

شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا

لیکن افسوس ہے کہ وہ اس پریشان خیالی کی وجہ پر پوری طرح غور نہیں کرتے۔ ہمارا علم و تجربہ شاہد ہے کہ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ مسلمانان ہند کی توجہ ہمیشہ اجنبی امداد کی طرف مصروف رہی یا مصروف رکھی گئی۔ انھیں اپنے فیصلے سے اپنے ملک میں اپنی حکومت پیدا کرنے کے خیال کی طرف نہ لایا گیا ہے، نہ آنے دیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے اس غلط روی میں حصہ لیا، انھیں پہلے دور میں تو قابلِ معافی سمجھا جا سکتا ہے لیکن اس بیداری کے زمانے میں جب یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ کسی بیرونی رہنمائی

پر بھروسہ کرنا ہمارے لئے زہر قاتل ہے کسی ایسے شخص کو معاف نہیں کیا جائیگا جو ہمیں آج بھی اس وہم باطل میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرے۔

ہمارا فکر عوام کے فکر سے ایک قدم آگے ہے۔ چنانچہ

حقیقی ہندوستانی جب ہم ہندوستانی کا لفظ بولتے ہیں تو ہمارے نزدیک اس کا صحیح مصداق فقط ہندوستانی مسلمان ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک ہندوستانی کے ساتھ لفظ مسلم لگانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ صحیح معنوں میں ہندوستانی وہ ہے جس نے ہندوستان کا انتشار دور کرکے اس میں وحدت پیدا کر دی ہو اور اُسے ایک راستے پر لگا دیا ہو۔ اس نقطۂ نگاہ سے ہندوستان کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل یہاں بھیل اور گونڈ قومیں بستی تھیں۔ ان کی تاریخ کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ ہم فی الحال صرف اتنا جانتے ہیں کہ آریوں نے ہندوستان میں پہلے پہل ایک قسم کی وحدت پیدا کی اور اشوک اعظم جیسا شہنشاہ پیدا کیا جس نے تقریباً سارے ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت پیدا کرکے داخلی افتراق کو دور کر دیا۔ آریہ لوگ پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے بھیل اور گونڈ کی ہندوستانیت کو منسوخ کر دیا۔ بشرطیکہ انہوں نے یہاں کوئی ہندوستانیت پیدا کی تھی۔

اس کے بعد اسلام اپنے پہلے دور میں سرحدات ہند تک پہنچ گیا۔ کابل اور غزنی جو تاریخی اعتبار سے ہندوستان کے آخری اضلاع تھے حضرت عثمان

ذوالنورین کے عہدِ خلافت میں فتح ہو چکے تھے۔ مگر ہندوستان کے اندر ایک نئی تحریک کی حیثیت سے اسلام چار سو سال کے بعد داخل ہوا۔

موجودہ ہندوستان میں آریوں کی حیثیت

غزنی کے مرکز سے محمود نے بڑھنا شروع کیا اور مسلمانوں نے پانچ چھ سو سال کے عرصے میں ہندوستان کی منتشر طاقتوں کو از سرِ نو جمع کر دیا اور اشوک کے بعد پھر ہندوستان میں عالمگیر جیسا ہندوستان گیر بادشاہ پیدا ہوا جسنے ساری ملک میں پچاس برس تک حکمرانی کی اور تمام ملک میں ایک قانون جاری کر دکھایا۔ یہ دوسری ہندوستانی طاقت تھی جس نے آریوں کو ہندوستانیت سے اسی طرح گرا دیا جس طرح آریوں نے گونڈ اور بھیل کو ہندوستانیت سے گرایا تھا۔ مگر آریوں کی گراوٹ ایسی نہ تھی جیسی گونڈ اور بھیل کی تھی۔ اس لئے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مسلمان اوّل درجے کے ہندوستانی ہیں اور ہندو یعنی آریہ دوم درجے کے ہندوستانی ہیں

عالمگیر کے بعد ہندوستان میں پھر بد نظمی شروع ہو گئی۔ اس پریشانی اور طوائف الملوکی کو برطانوی طاقت نے آکر دُور کر دیا۔ اب اگر برطانیہ اپنے آپ کو ہندوستانی کہنے پر راضی ہو اور اس کی ایک شاخ انیگلو انڈینوں کی طرح ہندوستانیوں کو اپنا وطن بنائے اور دہی اس اجتماعیت کا مرکز بن جائے آج یہ لوگ اوّل درجے کے ہندوستانی کہے جائیں گے اور مسلمان اور ہندو دوم اور سوم درجے کے ہندوستانی ہوں گے۔ مگر چونکہ ابھی تک برطانوی طاقت

ہندوستانیت قبول کرنے کو تیار نہیں ہے، اس لئے فی الحال مسلمان ہی اول درجے کے ہندوستانی شمار ہو سکتے ہیں۔

حکومت اور قلت وکثرت

پس جب مسلمان کہتا ہے کہ "ہندوستان ہمارا" تو اس میں ایک عظیم الشان حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج ہمارے پرانے اور نئے تعلیم یافتہ لوگ ان باتوں پر غور کرنے سے یکسر عاری ہو چکے ہیں۔ وہ صرف اپنی مردم شماری کے دھندوں میں پھنس کر رہ گئے ہیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ان کے جو حقوق ہیں، ان کے حصول کی کوشش نہیں کرتے۔ مسلمانوں کو جو اپنی تعداد کی فکر ہے، انھیں سوچنا چاہئے کہ کیا انگریز ہندوستان پر اپنی کثرت آبادی کی وجہ سے حکومت کر رہا ہے؟ اصل حقیقت یہ ہے کہ حکومت نہ کثرت پر موقوف ہے نہ قلت پر، بلکہ فکر صحیح پر منحصر ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس انسانیت کے لئے صحیح فکر موجود ہو اور اس کی تنظیم مکمل اور قوی ہو تو یہ صحیح حکمرانی کرتا ہے۔ یہ استعداد آج جتنی مسلمانان ہند میں موجود ہے، ہندوؤں میں نہیں ہے۔ انسانیت کا فکرِ سلیم مسلم کو چند گھنٹوں میں سکھایا جا سکتا ہے۔ مگر ہندوؤں میں خال خال افراد ایسے نظر آئیں گے جو اس فکر کو سمجھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ مگر عام ہندو سوسائٹی اس استعداد سے قطعاً عاری ہو چکی ہے اور نہ اسے یہ فکر صحیح سکھایا جا سکتا ہے۔ اسے سیکھنے کے لئے انھیں ایک عرصہ چاہیئے۔

فکری تنظیم کا اہل کون ہے؟

حکمرانی کے لیئے فکرِ صحیح کی تنظیم ضروری ہے۔ مسلمان ابھی اس تنظیم کے طریقے نہیں بھولا۔ اس نے اپنے نظام کے ساتھ یورپ کے اسلحہ کا استعمال بھی سیکھ لیا ہے۔ اس لیئے اسے عہدِ حاضرہ میں اس فکرِ صحیح سے کام لینے کے بہترین مواقع حاصل ہیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ ہندو بھی یورپی نظام کو قبول کر کے اپنی سوسائٹی کو آگے لے جارہا ہے۔ جہاں تک موجودہ واقعات کا تعلق ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ درست ہے کہ ہندوؤں نے بھی یورپی نظام کے بعض امور اپنا لئے ہیں۔ لیکن ہم پورے علم و یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ مسلمان کے پاس جو فلسفۂ عمل ہے اور جس کے زور پر وہ دنیا میں امامتِ اقوامِ عالم حاصل کر سکتا ہے، وہ فلسفۂ عمل ہندو کے پاس نہیں ہے۔ اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ کانگرس یورپی طریقۂ فکر سے پیدا ہوئی اور اسی آب و ہوا میں پروان چڑھی۔ جب تک وہ متفکرین کی جماعت رہی اس میں ارتجاعی عنصر بہت کم آیا۔ لیکن جس دن اسے حکومت کا ایک چھوٹا سا درجہ دیا گیا سارا ارتجاعی نظام کانگرس پر چھا گیا۔ کیا کانگرس یورپی طرز پر حکومت چلا سکی؟ اس کا جواب نفیِ محض ہے۔ حقیقت میں ہندو سرمایہ دار طاقت کو راضی کرنے کے سوا اس کا اور کوئی نصب العین نہیں ہے۔

سرمایہ داری اور ہندو

ہندو جب بھی کوئی نیا نظام پیدا کرتا ہے۔ تو اس کی بنیاد سرمایہ داری پر ہوتی ہے۔ چنانچہ گاندھی جی

جیسا شخص بھی انسانیت کا اتنا بڑا نمائندہ بن کر سرمایہ داری سے ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکا۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو کمیونسٹ ہیں مگر وہ بھی سرمایہ دار ہیں۔ ان کے مقابلے میں حسرت موہانی کو لیجئے جس دن اس نے اشتراکیت قبول کی وہ اپنی تمام جائداد ختم کر چکا اور اب وہ ایک کوڑی کا بھی مالک نہیں ہے۔ جواہر لال نے یورپ جا کر سوشلسٹوں کے ساتھ رہ کر سوشلزم سیکھا مگر حسرت اپنی ذاتی فکر کی کاوش سے اس مرتبے پر پہنچا ہے۔ یہ فرق ہے مسلم سوسائٹی اور ہندو سوسائٹی میں۔ مسلم جس وقت اپنے اصلی نظام پر آئے گا وہ سرمایہ داری کا بت توڑنے والا ہوگا اور آج دنیا میں سرمایہ داری کے سوا اور کونسا بڑا بت ہے جسے توڑنے کی ضرورت ہے۔

مسلمان سرمایہ داری کا دشمن ہے

مسلمان ہندوستانی ہے، اور وہ سرمایہ داری کا دشمن ہے اور وہ ہر غیر سرمایہ دار کے ساتھ جو مسلمان نہ ہو انسانیت کا سلوک کرنا جانتا ہے۔ آج تک ہندوستان میں ایسے اہل اللہ کی قبریں پوجی جاتی ہیں جنھوں نے انسانیت کی خدمت کی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ مسلم نوجوان قرآن حکیم کی طرف پوری طرح متوجہ ہو چکا ہے اور قرآن کی تعلیم موجودہ سرمایہ داری کی ضد ہے۔ اسمبلی کے موجودہ ممبروں کی سرمایہ داری سے مرعوب ہو کر مسلم نوجوان زیادہ دیر تک ان کے قابو میں نہیں رہ سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان میں مستقبل کو سنبھالنے

کی پوری صلاحیت اور طاقت موجود ہے، چونکہ ہندوستانی تشتت کو برطانیہ کی جانشینی میں وہی دور کر سکتا ہے، اور وہی ہندوستان میں عادلانہ نظام اجتماعیت پیدا کر سکتا ہے، اس لئے ماضی کی طرح آئندہ کے لئے بھی ہندوستانی کے لفظ کا صحیح مصداق وہی ہو سکتا ہے۔

ایک ہندوستانی کا نصب العین اس سارے فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان سلطان عالمگیر کے فکر کو نہ بھولیں مگر عالمگیر کی سلطانیت کو اپنا نصب العین نہ بنائیں بلکہ اسکے زمانے میں اسلامی فلسفے کی جو ارتقائی شکل شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے والد ماجد اور عم بزرگوار نے بتائی اور جسے حضرت شاہ صاحب نے محمد شاہ کے زمانے میں مدون کیا اسے عالمگیر کا ورثہ سمجھیں۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ انھیں غیر وقتی مسلمانوں کے پریشان کن پروگراموں میں نہیں الجھنا چاہیئے اور نہ اپنے گھر پر اپنا قبضہ جمانے کی کوشش میں برابر مصروف رہیں، اگر انھیں اس کام میں سو سال بھی لگ جائیں تو انھیں پروگرام تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد شاہ صاحب کے فلسفے کی روشنی پر ہم جو پروگرام سوچتے ہیں، اس کے بھی ایک دو حصے واضح کر دینا چاہتے ہیں۔

ہمارا ہندوستانی ہونا تو اس سے ظاہر ہے کہ ہم انڈین نیشنل کانگریس کے رکن بنا چاہتے ہیں۔ اب دنیا کا سیاسی مرکز یورپ میں منتقل ہو چکا ہے، ہم میں سے کسی ہندوستانی کو یورپ میں تعارف حاصل کرنا ہو تو اس کے لئے کانگریس بہترین عنوان ہے:۔

عدم تشدد ہمارے خیال میں کانگریس کی عدم تشدد کی پالیسی اس وقت تک ہندوستانیوں کے لئے لازم ہے جب تک انہیں یقین نہیں ہو جاتا کہ وہ لڑ کر اپنا ملک فتح کر سکتے ہیں۔ یہ اصول تیاری کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔ اس پر استقلال کے ساتھ عمل پیرا رہنا چاہیئے۔ جب ہم ملک آخری موقعے کے لئے تیار نہیں ہوتا اسے چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں حصہ نہیں لینا چاہئے۔ اس سلسلے میں ہمارا فکر گاندھی جی کے فلسفے کا پابند نہیں رہتا بلکہ ہمارے فکر کی بنیاد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی سیزدہ سالہ مکی زندگی پر ہے۔ گو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارک کے اس پہلو کی طرف ہمیں گاندھی جی کے پروگرام کی اشاعت کے بعد تنبہ ہوا۔

درجۂ نوآبادیات عدم تشدد کے بعد ہمارے پروگرام کی جو دوسری شق ہے وہ درجۂ نوآبادیات پر برطانیہ کے ساتھ مصالحت کر لینا ہے۔ کانگریس کے اندر ہندوستانی مسلمان نوجوان ایسی پارٹی بنائیں گا جو برطانیہ سے درجۂ نوآبادیات طے کر رہے گی۔ جن شرطوں پر بھی آزادی مل سکتی ہو، ان کی پوری قیمت ادا کرنے کے لئے یہ پارٹی تیار رہو گی۔ اس سے برطانیہ کے ساتھ ہمارا جھگڑا ختم ہو جائے گا اور ہمیں اپنی طاقت عامہ کو موجودہ اصول پر منظم کرنے اور عمومی سیاسی نظام اور عمومی تعلیم کے لئے پورا موقع مل جائے گا۔ اس ہوم رول میں جو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں، ہندو اور مسلم برابر

کے شریک ہوں گے اور ہندو اور مسلم صوبے برابر درجے پر رہیں گے۔ مگر صوبوں کی اکثریت اپنے اپنے صوبے میں قانون سازی پر یقیناً قابض رہے گی۔ اگر مسلم نوجوان اپنے اکثریت کے صوبے میں سرمایہ داری کو دھکا لگانا چاہے گا تو اسے کوئی چیز نہ روک سکے گی اور اس کا فائدہ اس کے صوبے کے ہر ایک مسلمان اور ہندو کو برابر پہنچے گا۔ اس آخری اصول کو واضح کرنے کے لئے ہم ایک تیسرا اصول واضح کریں گے۔

انتخابی طریق کار مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہماری پارٹی کوشش کرے گی کہ مسلمانوں کے ووٹ ہمیشہ اس کو ملیں مگر وہ مخلوط انتخاب کے اصول پر کام کرے گی اگر مسلم نوجوان اتنا بزدل ہے اور اعتماد علی النفس قطعاً کھو چکا ہے اور وہ اپنی اکثریت کے صوبے میں برسر کار نہیں آسکتا تو ہماری قومیت کا یہ طبقہ فنا کر دیئے جانے کے قابل ہے۔ لیکن ہمیں یقین کامل ہے کہ ہندو اور مسلمان ہماری پارٹی کے نمائندوں کو اپنے مشترکہ ووٹوں سے ضرور منتخب کریں گے اور مسلم نوجوان قطعی طور پر برسر اقتدار آئے گا۔ لیکن وہ اپنے اقتدار کو محض قانون سازی میں محدود رکھے گا۔ کوئی قانون اکثریت کی منشا کے بغیر اس کے احاطے میں نہیں بن سکے گا۔ چونکہ ووٹروں کی تعلیم صحیح انسانیت کے اصول پر ہوگی اس لئے مسلم اکثریت محض نام کی اکثریت ہوگی ورنہ حقیقت میں وہ انسانیت کی نمائندگی ہوگی۔ ہر ووٹر اپنی صحیح تربیت یافتہ ذہنیت کے مطابق ووٹ دے گا۔ اور اس کا نمائندہ

صحیح انسانیت کے اصولوں کے مطابق اس کا دیانت کے ساتھ استعمال کرے گا۔ مسلم نوجوان اپنی قانون سازی کے حق کی حفاظت میں اپنی طاقت کا آخری حصہ تک صرف کر دے گا۔ مگر قانون چلانے میں ملک کی تمام بہترین طاقتوں کو یکساں حصہ دے گا۔ اس میں وہ ہندو اور مسلم کا امتیاز روا نہ رکھے گا۔ بایں ہمہ وہ اس بات کا خیال رکھے گا کہ قانون کی روح کہیں پامال نہ ہو رہی ہو۔

غیر نزاعی اصول

ان اصولوں پر ہماری پارٹی اسلامی اکثریت کے صوبوں میں صحیح اسلامی اور انسانی فضا پیدا کرنا چاہتی ہے۔ یہ فضا نہ ہندوستانیت کے منافی ہے اور نہ اس میں ہندوؤں اور سکھوں سے تنازعے کا امکان ہے اور نہ برطانیہ کے ساتھ منازعت ہے۔

اگر اس قسم کی حکومت قائم کرنے میں دس بیس سال لگ جائیں تو ہمیں صبر سے کام کرنا ہو گا، کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہمارا مقصد ناکام ہونے والا نہیں ہے۔ یہ وہ پروگرام ہے جسے ہم لیگ اور علماء کے غیر مطمئن افراد کی توجہ میں لانا چاہتے ہیں اور اسے ہم ملک کی حکمراں طاقت سے بھی چھپانا نہیں چاہتے۔ ہم اس پروگرام کی تکمیل میں اقلیت کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں بشرطیکہ وہ اس پر کامل طور پر غور کر کے اس میں شریک ہونا پسند کرے۔

ہم اس تحریک کو لاہور سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا دوسرا مرکز لکھنو ہو گا اور ہم دونوں کو دہلی میں جمع کریں گے۔

غیر اختلافی تخیل

ایک آخری چیز بھی لکھ دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ چونکہ یہ پارٹی غیر مسلم عناصر کو بھی شامل کرنے کے لئے تیار ہے اس لئے دعوت فکری کے لئے وہ غیر مسلم طاقتوں کو ایک ایسے فلسفے کی طرف دعوت دیتی ہے جو مسلم و غیر مسلم دونوں کے لئے یکساں قابلِ تسلیم ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگرچہ ہم اشتراکیت کے انتہا پسندانہ اقتصادی پروگرام کے قابل نہیں ہیں لیکن ہم محنت کش طبقے کے لئے روٹی، کپڑے، تعلیم اور صحت کی اصلاح کو نظر انداز کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس میں بھی ہم مسلم و غیر مسلم کا امتیاز روا نہیں رکھیں گے۔ کیونکہ یہ تو اس فلسفیٔ فکر کا جزو لازم ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

مسلم لیگ کی توجہ کیلئے

مسلم لیگ کے اراکین کے سامنے ہم ایک خاص مسئلے پر بھی روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہمارے لیگی دوست فیڈریٹڈ گورنمنٹ کی مرکزیت کو بہت شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے وہ ۳۵ء کی تجویز اصلاحات کو روکنا ضروری سمجھتے ہیں۔ انھیں معلوم رہے کہ پارلیمنٹ کا یہ فیصلہ آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ہم اس میں ایک ترمیم پیش کرنے پر زور دینگے۔ جس کی منظوری کے بعد امید کامل ہے کہ انکے تمام خطرات دور ہو جائیں گے اور جملہ شبہات بھی دور ہو جائیں گے۔

ایک دستوری اصطلاح

ہم چاہتے ہیں کہ پارلیمنٹ اس قانون [illegible]لاحات [illegible] ایک دفعہ کا اضافہ

کر دے جس کا منشا اس مطلب کا اظہار ہو کہ اب تک جن علاقوں کو صوبہ کہا جاتا تھا انھیں اب اسٹیٹ مانا جائے۔ اس میں نہ پارلیمنٹ کو کوئی اعتراض ہو نہ کانگریس کو، کیونکہ اس پر نہ نظام میں کسی تبدیلی کی ضرورت پڑتی ہے نہ خرچ میں اضافہ ہوتا ہے۔ جو رقبہ ایک زبان رکھتا ہے اور معاشرت میں تقریباً یکساں ہے۔ اسے ایک ملک یا اسٹیٹ ماننا حقیقت کے زیادہ قریب ہے اور جدید نظام میں اسے صوبہ قرار دینا بالکل بے معنی ہوگا۔ بلکہ اس علاقے کے باشندوں کی توہین ہوگی۔

۲۳ ستمبر ۱۹۴۰ء

یادگارِ شیخ الہند کا افتتاح

جامعہ ملیّہ دہلی میں

ان ولیی اللہ الذی نزل الکتٰب وھو یتولی الصالحین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید مجھے جاننے والے بھولے نہیں ہوں گے کہ میں نے جون ۱۹۲۰ھ میں ہندی میں "یادگار شیخ الہندؒ" کے لئے مختصر پروگرام شائع کیا تھا۔ اس میں مسلمانوں کے متمول طبقہ سے اپیل کی گئی تھی۔ کہ جس قدر حضرات اس اسکیم کے مقصد کو سمجھ سکتے ہیں اور اُسے ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے فی الجملہ مفید مانتے ہیں وہی دوست ایک خاص مقدار میں روپیہ جامعہ کے خزانہ میں جمع کرادیں تاکہ مجھے عمر کے اس آخری مرحلہ میں پُرشوق نوجوان عزیزوں کو اپنے علم و تجربہ سے تعارف کرانے میں آسانی ہو۔

آج کل حالات ایسے ہیں کہ کسی امتحانی اسکیم پر روپیہ خرچ کرنے کی دعوت اپنے اندر جذب کی پوری قوت نہیں رکھتی۔ غالباً اسی قسم کے اعذار نے مسلمانوں کو ادھر متوجہ نہیں ہونے دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میری نقل و حرکت سے اور میری مختلف

مقالات پڑھ کر اگر مجھ سے بدظن ہوگئے ہوں کہ میں اپنا کام شاید جم کر نہ کرسکوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ بدظنی بڑھانے کے اور بھی اسباب پیدا ہوتے رہے، مگر میں اِدھر ملتفت نہیں ہوا۔ میں اگر کسی کو اپنا مطلب سمجھا کر اُسے اپنی رفاقت یا امداد پر آمادہ نہیں کرسکتا تو لڑجھگڑ کر راستہ کی آسانی پیدا کرنا اس وقت میری طاقت سے خارج ہے۔ اس لئے توکلاً علی اللہ جس قدر کام کرسکتا ہوں، تجویز کے نصاب مکمل ہونے (یعنی دس عربی اور دس انگریزی کے سند یافتہ مشتغلین کی ضروریات مہیا ہونے) سے پہلے تمہید کے طور پر شروع کردیتا ہوں۔

میں بعض دوستوں کے مشورے سے جن میں سے محترم خواجہ عبدالحی صاحب کا نام لے سکتا ہوں، رمضان ۱۳۵۹ھ ہجری کے آخر ہفتہ میں دہلی پہنچا۔ آج ۱۶ شوال ۱۳۵۹ھ ہجری (۱۷ نومبر ۱۹۴۰ء ہندی) سے جس قدر مستعدین اپنا خرچ خود برداشت کرسکتے ہیں، فقط انھیں کی رفاقت میں جامعہ ملیہ کا بیت الحکمۃ شروع کردیتا ہوں۔ جسے آگے چل کر "یادگار شیخ الہند" اور ولی اللہ اکاڈمی "Wali - ullah Acadmy" کے نام سے پکارا جائے گا۔

میرے لئے ضروری ہے کہ محترم المقام ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب بالقابہ شیخ الجامعہ اور ان کے رفقاء کی شکرگذاری کا اس موقعہ پر اظہار کردوں۔ انھوں نے پہلے دن سے اعلیٰ درجہ کی فراخدلی سے تحریک کا خیر مقدم کیا ہے۔ اور اسوقت بھی جامعہ ہمیں ہر قسم کی مالی امداد دینے کے لئے تیار ہے۔ مگر میں اس

کے بجٹ پر بجز اشد ضرورت کے کسی قسم کا بوجھ ڈالنا اپنی مصلحت کے خلاف سمجھتا ہوں۔ ہماری درسگاہ اندرونی استقلال قائم رکھنے کے بعد اسی طرح جامعہ ملیہ کی جائداد بنے گی جیسے بنیادی تعلیمی اسکیم کا ٹریننگ اسکول جامعہ کا حصّہ ہے۔

یادگار شیخ الہند میں ولی اللہ فلاسفی

یاد رہے کہ ہم اسے کسی عارضی تحریک یا وقتی جوش سے متاثر ہو کر شروع کرنا نہیں چاہتے بلکہ ہم اپنے علم اور تجربہ کا عملی نمونہ قائم کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ سے ہمارا تعلق پچاس برس سے دنیا جانتی ہے۔ اس وقت ہم اپنی تحقیقات کا نچوڑ آئندہ نسل کے سامنے لانا چاہتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستانی قومی فکر میں ایک معقول خیال کا اضافہ کریں، جس سے ایک مسلمان بھی اپنے ہندوستانی ہونے پر اسی قدر فخر کر سکے جس طرح دنیا کے عقلمند محبانِ وطن مسلم ہوں یا غیر مسلم اپنے اپنے وطن کی عزت پر ناز کرتے ہیں، وہ خیال دُنیا کے ایک غیر معروف لیکن بہت بڑے فلاسفر امام ولی اللہ دہلوی کا فلسفہ ہے۔ یہ حکمت جس طرح مسلمانوں کے دو معروف فلاسفروں شیخ اکبر ابن عربی اور امام ربانی مجدد سرہندی کے متبعین کو مطمئن کر سکتی ہے، اس سے زیادہ ہندو فلاسفی کے مختلف اسکولوں کے نظریات کو گیتا کے اسلوب پر جمع کر رہی ہے۔ جس قدر اہلِ علم ولی اللہ

فلاسفی میں تبحر حاصل کریں گے۔ وہ اپنے ہم خیال ہندوستانیوں پر ہندو ہوں یا مسلمان یکساں اعتماد کریں گے۔

مسلمانوں کی اکثریت اگر نیشنل کانگریس سے علیحدگی پر اصرار کرتی رہی، تو کانگریس ایک پارٹی کانفرنس بن جائے گی اور ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ اس سے ہماری ایک خاص قسم کی پچاس سالہ ملکی کوشش بیکار ہو جائے گی۔ جس کے ہم حقیقی حصہ دار ہیں —— مسلم لیگ کے لیڈروں کے رویہ سے اگر ہم قطع نظر بھی کر لیتے ہیں تو احرار اور جمعیۃ العلماء کا معاملہ اس سے زیادہ ناقابلِ فہم ہے۔ وہ کانگریس کے ہمدرد اور وفادار بن کر بھی کانگریس سے باہر اپنے لئے مستقل سیاسی پروگرام تجویز کرتے ہیں۔ ہم اس پریشان خیالی کو دور کرنے کے لئے اِن جماعتوں کو کانگریس کے اندر ایک مستقل پارٹی کی صورت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس کے لئے ولی اللہ فلاسفی سے بہتر نصب العین نہیں مل سکتا۔

اس فلاسفی کی تعلیم سے ہمیں ایک اور فائدہ حاصل کرنا بھی مقصود ہے۔ ہم اپنی اس نئی جماعت کو سرکاری یا مذہبی خدمات کے لئے طیار نہیں کر رہے اس لئے انھیں ہم خدمت خلق کا پروگرام ہی دے سکتے ہیں۔ ولی اللہ فلاسفی چونکہ تمام ادیان کا مرجع انسانیت اور اس کی تکمیل کو قرار دیتی ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ جس قدر یہ فکر کسی ذہن میں راسخ ہوگا اسی قدر وہ خلق اللہ کا اچھا خادم بن سکے گا۔

یادگار شیخ الہند اور برٹش کامن ویلتھ

جس طرح ہندوستانی قومی فکر میں ہم ولی اللہ فلاسفی کو مرکزی درجہ دینا چاہتے ہیں۔ اسی طرح ہم عملی پروگرام کے لئے برٹش کامن ویلتھ میں رہنے کا فیصلہ کرنے والی پارٹی نیشنل کانگریس کے اندر پیدا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ کام اگرچہ لبرل ہم سے اچھی طرح کر سکتے تھے مگر وہ کانگریس کا نصب العین قبول نہیں کرتے۔ اس لئے بچھڑ گئے اور ہم نے عدم تشدد کے ساتھ آزادی کامل حاصل کرنے کا مطمح نظر اپنے اصلی افکار میں ناکام ہونے کے بعد قبول کیا ہے۔ اس لئے باسانی کانگریس میں ایسی پارٹی بنا سکتے ہیں جو عملاً ہوم رول حاصل کرنے پر اپنی تمام طاقت صرف کر دے گی۔ اس میں ہم اپنے نوجوانوں کے انقلابی افکار کو منظم کر لیں گے۔ وہ نراج اور اشتراکیت سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھیں گے۔ کانگریس کریڈ ماننے کے لئے استقلالِ تام ہمارا نصب العین تو رہے گا لیکن جب تک برطانوی طاقت ہمارے ملک پر قابض ہے، ہم عوام کے لئے کوئی ایسا پروگرام نہیں بنا سکتے جو ہوم رول سے آگے قدم بڑھائے۔ اس حالت میں نہ تو ہم عوام سے تعلق توڑ سکتے ہیں، جیسے پچھلے پچاس برس میں غلطی سے ایسا کرتے رہے اور نہ ان کو بلا پروگرام فقط جذبات کا تابع بنا سکتے ہیں۔ ورنہ ہر ہوسناک "جام و سنداں باختن" کا بہروپ بھر کر عوام کو جو ہماری ریڑھ کی ہڈی ہیں پریشان کرتا رہے گا۔

ہمارے پروگرام کو دانشمندی سے احاطہ کرنے کے بعد ہمارا نوجوان جس طرح عدم تشدد کا پابند رہے گا۔ اسی طرح اگر اسے ضرورت محسوس ہو گی تو وہ گورنمنٹ پارٹی کے ساتھ کوآپریشن سے بھی محترز نہ رہے گا۔

یادگار شیخ الہند اور دہلی کا ولی الہی اسکول اور مرحوم دہلی کالج

دہلی سے ہمارے افکار و اعمال کا تاریخی تعلق ہے۔ امام ولی اللہ کے اتباع کا مرکز امام عبد العزیز اور ان کے جانشین الصدر الحمید مولانا محمد اسحٰق کے آخری وقت تک دہلی ہی رہا۔ دیوبندی جماعت کے بانی حاجی امداد اللہ بھی مولانا محمد اسحٰق کے مدرسہ کے فیض یافتہ تھے اور انہی کی سیاسی رہنمائی کے موافق حاجی صاحب نے ان کے بعد دہلی میں اپنا اجتماعی مرکز بنایا جو ۱۸۵۷ء سنہ ہندی کے ناکام انقلاب کے بعد دیوبند منتقل کر دیا گیا۔

بانیانِ دار العلوم دیوبند مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد، مولانا محمد یعقوب نے دہلی کالج میں شعبۂ شرقیہ کے صدر مدرس مولانا مملوک علی سے تعلیم پائی۔ دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب، استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی صدر مدرس کے صاحبزادے تھے۔ اور مولانا محمد قاسم رشتہ میں مولانا مملوک علی کے بھتیجے ہوتے ہیں۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے دہلی میں نظارۃ المعارف کو اپنا

ایک مرکز بنایا پھر جامعہ ملیہ کا افتتاح ان کے ہاتھ پر ہوا۔ آخر میں ایک امیر الجامعہ ڈاکٹر انصاری کے گھر پر دہلی میں وفات پائی۔ اب اگر شیخ الہند کی یادگار دہلی میں قائم ہوئی تو وہ ہمارے مشائخ کے سارے سلسلہ کی یادگار ہوگی۔

شیخ الہند اور جامعہ ملیہ ہم نے مکہ معظمہ میں اندازہ کر لیا تھا کہ اگر کبھی وطن پہنچے تو ہم اپنا کام جامعہ ملیہ کے باہر شاید جاری نہ کر سکینگے، اسی مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ ہم نے شیخ الجامعہ کی خدمت میں درخواست بھیجی تھی۔ اس کے ساتھ ہمارے دوستوں نے دوسرے مراکز سے بھی دعوت دی کہ ہم ان کی رفاقت میں اپنا کام شروع کریں۔ ایک سال سے زیادہ وقت ہم نے ان کے معاملات سمجھنے میں صرف کیا، مگر نتیجہ وہی نکلا جو ہم نے پہلے فیصلہ کیا تھا۔

ہم نظریات تو وہی مانتے ہیں جو امام ولی اللہ دہلوی سے لے کر شیخ الہند تک ہمارے بزرگوں نے مقرر کئے۔ لیکن آج کے دورِ انقلاب میں ان مقاصد عالیہ کو حاصل کرنے کے لئے پروگرام ہم یورپ سے سیکھنا ضروری سمجھتے ہیں، جیسے تمام مشرقی ممالک میں سو سال سے ہو رہا ہے، جاپان، ترکی اور پچھلی جنگ کے بعد ایران، افغانستان اور تمام عربی ممالک اور آخر میں نیشنل کانگریس کے رہنما سب یورپ سے سیکھتے رہے ؛ اس لئے ہم نوجوانوں کو اپنے علمی نظریات کے ساتھ عملی تجارب سکھانے کے لئے انھیں یوروپین بننے

کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لئے جامعہ ملیہ ہی کی رفاقت ممکن اور پھر مفید ثابت ہوگی۔

یادگار شیخ الہند اور سندھ کے راشدی مشائخ

میں اسے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میری زندگی کا سندھ اور دیوبند سے خصوصی تعلق ہے۔ میں نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی اور میری علمی اور سیاسی تربیت میں حضرت مولانا شیخ الہند خصوصی مربی تھے۔ جن سے میرا رابطہ ۱۸۹۹ء ہندی سے شروع ہو کر ان کی وفات کے سال ۱۹۱۹ء ہندی تک مسلسل قائم رہا۔ اسکے بعد ارشاد طریقہ اور تربیت صحبت اور عملی زندگی سندھ کے راشدی مرشدوں کے ظل عاطفت میں شروع ہوئی اور بفضلہ تعالیٰ میرا یہ تعلق آج تک قائم ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ امام ولی اللہ دہلوی کے حلقۂ مسترشدین میں سندھ کے نامور علماء داخل تھے۔ مثلاً مخدوم معین الدین تتوی جو شاہ عبداللطیف صاحب رسالۂ توحید کے رفیق اور مخدوم محمد ہاشم کے مشائخ میں ہیں۔ وہ شاہ ولی اللہ کو اپنا امام مانتے ہیں۔ جب امام عبدالعزیز کی جماعت مجاہدین سندھ سے گذری تو راشدی مشائخ میں سے شیخنا مولانا سید محمد حسن جیلانی اور مولانا سید صبغۃ اللہ لکیاری اس حلقہ میں شامل ہو گئے۔ آخر میں میرے مرشد حضرت حافظ محمد صدیق (بھرچونڈی) کے دونوں بڑے خلیفہ مولانا غلام محمد (دین پور) اور مولانا تاج محمد (امروٹ) اور سید صبغۃ اللہ کے خاندان سے مولانا راشد اللہ صاحب العلم (

حضرت مولانا شیخ الہند سے ملحق ہو گئے۔ مولانا شیخ الہند کی یادگار سے جس طرح دیوبند اور دہلی کے سلسلہ کی یاد تازہ رہے گی، دہلوی، دیوبندی رفقاء اور راشدی اخوانِ طریقہ سے میری پر زور استدعا ہے کہ وہ یادگار شیخ الہند کو ہی اپنے مشائخ کی یادگار سمجھیں، جامعہ ملیہ دہلی میں اس مرکز کو مضبوط بنائیں۔ اور اس کے فروع اپنے ہاں قائم کرنے کی کوشش کریں۔

ابتدائی کارروائی کا پروگرام

اب ہم اپنے کام کا مختصر پروگرام لکھتے ہیں۔ بیت الحکمۃ کا نصاب تعلیم تو ہم پہلے شائع کر چکے ہیں۔ یعنی ولی اللہ فلاسفی سے قرآن عظیم کا سمجھنا اور انسانیت کے اصول پر کاشتکاروں کی علمی اور عملی خدمت کرنا۔

اس تعلیم دینے میں بالفعل ہمارے ساتھ جامعہ کا ایک پروفیسر شریک رہے گا۔ اور دوسرا معاون ہمارا ہم مسلک ایک مولوی ہوگا۔ اگر اللہ کو منظور ہے تو جامعہ کا بیت الحکمۃ جسے ہم شروع کر رہے ہیں "حکمۃ امام ولی اللہ دہلوی" کا مرکزی کالج بن کر رہے گا۔ اس کے متعلق ابتدائی اور اعلیٰ اسکول اطراف مملکت میں قائم ہوتے رہیں گے۔ مثلاً سندھ کے مدرسہ دار الرشاد اور مظہر العلوم جس قدر کام ہو رہا ہے۔ یا دین پور ریاست بہاولپور اور لاہور میں جس کام کی ابتداء ہو چکی ہے۔ یہ مختلف تعلیم گاہیں ترقی کرکے جامعہ کے اس مرکز کے لئے فروع بن جائیں گی۔

مرکزی تعلیمگاہ کی تعمیر جامعہ نگر میں "یادگار شیخ الہند" کی مستقل عمارت کا خاکہ یوں سمجھنا چاہیئے، وسط میں ایک خوبصورت مصفی مسجد ہوگی۔ اس کے گرد میدان چھوڑ کر چاروں طرف تعلیم گاہ اور اس سے باہر پھر میدان چھوڑ کر چاروں طرف دارالاقامۃ بنے گا۔

بالفعل جامعہ نگر کے قریب کسی گاؤں میں طالب علموں کے رہنے کیلئے جو مکان میسر آیا کرایہ پر حاصل کرلیا جائے گا اور بہت جلد بفضلہ تعالیٰ جامعہ نگر کے احاطہ میں بقدر ضرورت دارالاقامۃ بنا لیا جائے گا۔ اس تعلیم کے لئے جامعہ کی عمارت میں بعض کمرے استعمال کے لئے مل جائیں گے چنانچہ تیسری منزل پر شمالی گنبد والے کمرہ میں تعلیم شروع کردی گئی ہے۔

جامعہ نگر میں میرا قیام جہاں تک میری صحت برداشت کر سکتی ہے، میں کراچی سے دہلی تک اس تحریک کے مرکز اور اس کے فروع کی خدمت کے لئے سفر کرتا رہوں گا اور جب کبھی حالات مناسب پیدا ہوتے گئے، دہلی کے مشرقی علاقہ میں (جس کے مراکز لکھنو، بنارس پٹنہ ہیں) اور جنوبی علاقہ میں (جس کا مرکز اجمیر ہے) اس تحریک کے فروع قائم کرنے کے لئے سفر کے حدود وسیع ہوتے جائیں گے۔

بالفعل اپنے اوقات اس طرح تقسیم کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ ہر دو مہینے جامعہ میں رہنے کے بعد ایک مہینہ سندھ جایا کروں گا۔ طالب علم

اس مہینہ میں ضبط اور مطالعہ میں مصروف رہیں گے، پروفیسر اور استاد ان کی نگرانی اور معاونت کریں گے۔ اس طرح آٹھ مہینے مسلسل کام کے بعد ایک مہینہ تعطیل ہوگی اور تین مہینے کے لئے سب طالب علم افادہ و استفادہ کے لئے ملک میں ایک خاص پروگرام کی پابندی سے دورہ کریں گے۔ یہ چار مہینے میرے دوسرے مشاغل کے لئے فارغ ہوں گے۔

میری دلچسپی کا سامان ہم ایک طویل زمانہ دوسری قوموں کی ترقی کے سامان دیکھتے دیکھتے پہلے حسرت اور پھر وحشت کے غلبہ سے پریشان ہوگئے تھے۔ اگر چند روز اور اسی طرح رہتے تو ممکن تھا کہ ہم اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتے۔ وطن پہنچنے سے آخری صدمہ کا خوف تو جاتا رہا۔ مگر اب تک چونکہ ہماری منشار کے موافق کام کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا ہماری وحشت پر کوئی مستقل اثر نہیں ہوا۔

یادگار شیخ الہند کا کام شروع کرنے کے ارادے سے جب ہم جامعہ نگر پہنچے تو سب سے پہلے جامعہ کی شاندار عمارت سے ہم متاثر ہوئے۔ ہم نے استانبول میں باسفورس کے کنارے پر کالج دیکھے ہیں۔ ہمیں وہی لطف جمنا کی اس وادی میں نظر آیا۔ جب ہم اسے اپنی چیز سمجھتے ہیں تو دماغ کی گہرائی تک سرور محسوس کرتے ہیں۔

ہم اللہ کا شکر کرتے ہیں کہ اس نے ہمارے نوجوان کو توفیق عنایت

کی جس نے اپنی اولوالعزمی سے قوم میں معیاری زندگی کا اساس قائم کرلیا۔ خدا کرے کہ جامعہ کے محصلین قوم کے ادنیٰ طبقہ کو اس معیار تک لانے میں کامیاب ہوں۔

میں نے فاضل استادوں کو بچوں کے ساتھ کھیلتے اور پڑھاتے دیکھا۔ ہماری آنکھ اور ہمارے کان جب دہلی کی شستہ زبان میں ایک اعلیٰ فکر بچوں کے ذہن میں راسخ کرنے کا عمل محسوس کرتے ہیں تو ہمیں اس قدر راحت ملتی ہے جسے ہم بیان نہیں کر سکتے۔

ہماری طبیعت جب سے ہم وطن میں آئے سبزہ اور بچوں کو دیکھ کر فی الجملہ سرور حاصل کرتی رہی۔ الحمد للہ کہ جامعہ نگر میں ہمیں دونوں چیزیں ملیں ع

یہ جھاڑیاں چمن کی یہ میرا آشیانہ

جامعہ کے اساتذہ اور منتظمین کو جہاں تک ہم سمجھ سکتے ہیں، وہ اس تحریک کی ہمدردی سے معمور ہیں۔ ہم اُسے اللہ رب العزت کی ایک بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں۔

واللہ الموفق والهادی و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

۲۲ نومبر ۱۹۴۰ء سنہ ہندی

بزنت الحکمۃ جامعہ نگر دہلی

بیت الحکمت

حکمت الامام ولی اللہ دہلوی

کچھ کذب وافترا ہے، کچھ کذبِ حق نما ہے
یہ ہے بساط اپنی، وہ ہے کمال اپنا (حالی)

ہم ہندوستانی سیاست کے اس دور کو جو رولیٹ ایکٹ Rowlett Act کی ایجی ٹیشن Agitation سے شروع ہوا، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا دور مانتے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر گورنمنٹ شیخ الہند کی کارروائیوں سے مطلع نہ ہوتی تو نہ رولیٹ کمیشن Rowlett Commission بیٹھتا۔ نہ کانگریس کی تیزگام پارٹی کو اس طرح ترقی کا موقعہ ملتا

ہماری دماغی تکلیف انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری عقلمند اور آگے بڑھ کر کام کرنے والے نوجوان شیخ الہند کا ذکر تک بھولتے جاتے ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ اس سے ہم ہندوستان کے میدانِ سیاست میں بالتدریج پسپائی پر مجبور ہوتے جائیں گے۔ اس لئے ہم نے مکہ معظمہ میں فیصلہ کر لیا تھا کہ جب کبھی ہم وطن پہنچے یا ہماری رہنمائی میں کوئی کام چل سکا تو ہم جامعہ ملیہ دہلی

میں "یادگار شیخ الہند" ضرور قائم کریں گے۔ چونکہ ہماری شخصیت کا تمام علمی و سیاسی ارتقار اس مرد خدا کے اتصال سے وابستہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ یہ تحریک ہمارے لئے بھی تقدم کا راستہ صاف کر دے گی۔ اگرچہ ہمارے خلاف یہ بدگمانی پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر اس وقت ہمارا نقطۂ نظر اپنے شخصی تفوق سے قدرے بلند ہے۔

ہماری سوچی سمجھی ہوئی مستقل رائے ہے کہ اگر مسلمانان ہند اپنا تعلق حکیم الہند امام ولی اللہ دہلویؒ کے مجددانہ پروگرام سے قائم نہ کریں گے تو ان کی قومی تحریک اپنی تاریخی عظمت کھو بیٹھے گی۔ اگر مفکرین کا کوئی طائفہ ہمارے اس فکر کو قابلِ قبول سمجھے تو اس کے بعد ہم دنیا کو منوا سکتے ہیں کہ ہمارے دور کو فتاوائے عالمگیری کے تدوینی زمانہ سے ملانے کے لئے کوئی عروۂ وثقیٰ مل سکتا ہے تو وہ فقط حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ہی ہو سکتے ہیں۔

ہم ہندوستان پہنچ کر اپنی پریشان حالی سے جس قدر فرصت نکال سکے، اس میں یادگار شیخ الہندؒ کے فکر سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں ہوئے۔ چنانچہ ہم نے:

(۱) سب سے پہلے انڈین نیشنل کانگریس میں اپنی مستقل پارٹی بنانے کا اعلان کیا۔

(۲) اس پارٹی کے اصول اساسیہ میں حکیم الہند امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے کو ایک مستقل غیر متبدّل اصول قرار دیا۔

(۳) یہ فلسفہ پڑھانے کے لئے بیت الحکمۃ کی تحریک شروع کر دی۔ بیت الحکمۃ کا نصاب ہم نے مکہ معظمہ ہی میں پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اور گزشتہ سال

زیادہ تر وہی طالب علم اپنے باقی ماندہ نصاب کی تکمیل کیلئے دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔

(۴) اس علمی تحریک کو اس بڑے استاد کی یادگار بنایا۔

(۵) اس تحریک کو مستقل طور پر چلانے کے لئے جمعیۃ خدام الحکمۃ کا نظام بھی تجویز کیا۔

ہم اپنے موجودہ حالات میں اس راستے پر دھیمی رفتار سے چلنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ہم جب کبھی جامعہ ملیہ میں گئے۔ بیت الحکمۃ بنانے کی دعوت دیتے رہے۔ بالآخر ۱۷ نومبر سنہ ۱۹۴۰ء جامعہ نگر میں بیت الحکمۃ (یادگار شیخ الہند) کا افتتاح ہو گیا۔

اس مرکزی بیت الحکمۃ کی تمہید اور تائید کے لئے ہم نے دار الرشاد (گوٹھ پیر جھنڈا) مظہر العلوم (کراچی) دین پور اور لاہور میں جس قدر موقعہ ملتا رہا بیت الحکمۃ کی شاخیں قائم کرتے رہے۔ چنانچہ ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۳۹ء ہندی کو جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی کا دار الرشاد میں اعلان ہوا۔ ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۳۹ء کو دار الرشاد میں اور ۲۸ دسمبر کو مظہر العلوم کراچی میں بیت الحکمۃ قائم ہو گئی۔ اسوقت خدا کے فضل وکرم سے دین پور کا بیت الحکمۃ جو ۲۲ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء ہندی کو کھلا۔ مستقل آمدنی کا مالک ہے۔ لاہور میں مولانا احمد علی سلمہ کے جوان شاگردوں نے نومبر سنہ ۱۹۴۰ء ہندی فاروق گنج میں بیت الحکمۃ کی بنیاد ڈالی۔

ہم بیت الحکمۃ میں قرآن عظیم کے ساتھ حضرت حکیم الہند امام ولی اللہ کا فلسفہ اور حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی کتابیں پڑھاتے ہیں۔ ہم حضرت شیخ الہند

کا خطبہ جو انہوں نے مولانا محمد قاسم کی کتاب "حجۃ الاسلام" کے شروع میں لکھا تھا اس کو سامنے رکھ کر اس بیت الحکمۃ سے بہتر ان کے لئے یادگار سوچ ہی نہیں سکتے۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں کہ "اب طالبانِ حقائق اور حامیانِ اسلام کی خدمت میں یہ درخواست ہے کہ حضرت خاتم العلماء (قاسم العلوم والخیرات سیدی ومولائی حضرت مولانا مولوی محمد قاسم متعنا اللہ بعلومہ ومعارفہ) کے رسائل کے مطالعے میں کچھ وقت ضرور صرف فرمائیں۔ اور پورے غور سے کام لیں اور انصاف سے دیکھیں کہ ضروریاتِ موجودہ زمانہ حال کے لئے وہ فائق اور مختصر اور بہتر اور مفید ہیں یا نہیں۔ باقی خدام مدرسہ عالیہ دیوبند نے یہ تہیہ بنامِ خدا کر لیا ہے کہ تالیفاتِ موصوفہ مع بعض تالیفات حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ وغیرہ (مثل مولانا رفیع الدین و مولانا محمد اسمعیل شہید) نصابِ تعلیم میں داخل کر کے ان کی ترویج میں اگر حق تعالیٰ توفیق دے، تو جان توڑ کر سعی کی جائے اور اللہ کا فضل حامی ہو تو وہ نفع جو ان کے ذہن میں ہے، اوروں کو بھی، اس کے جمال سے کامیاب کیا جائے۔

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ ہوا۔ ہوا۔ کرم سے تیرے جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا"

۱۰ فروری سنہ ۹۴۲ ہندی

بیت الحکمۃ، قاسم العلوم لاہور